MUD-010

Special Study of Meer Taqi Meer and Mirza Ghalib

میر تقی میرؔ اور مرزا غالبؔ کا خصوصی مطالعہ

ignou
THE PEOPLE'S UNIVERSITY

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی

اسکول آف ہیومنٹیز

بلاک

2

میر تقی میرؔ: فکروفن (اول)

بلاک 2 کا تعارف

اکائی 6

میرؔ کی قصیدہ نگاری اور قصیدہ ''درمدح آصف الدولہ'' کی تدریس وتفہیم 91

اکائی 7

میرؔ کی مثنوی نگاری اور مثنوی ''دریائے عشق'' کی تدریس وتفہیم 109

اکائی 8

میرؔ کی مرثیہ نگاری اور مرثیہ ''ایمان یہ کیسا تھا کیسی یہ مسلمانی'' کی تدریس وتفہیم 127

اکائی 9

میرؔ کی دیگر شعری اصناف کا جائزہ 145

اکائی 10

''نکات الشعرا'' کا تنقیدی جائزہ 159

بلاک 2 تعارف

دوسرا بلاک ''میرتقی میرؔ: فکروفن (اول)'' کے نام سے قائم کیا گیا ہے۔ اس بلاک میں کل پانچ (۵) اکائیاں (اکائی نمبر ۶ تا ۱۰) شامل ہیں۔ چھٹی اکائی ''میرؔ کی قصیدہ نگاری اور قصیدہ 'درمدح آصف الدولہ' کی تدریس و تفہیم''، ساتویں اکائی ''میرؔ کی مثنوی نگاری اور مثنوی 'دریائے عشق' کی تدریس وتفہیم''، آٹھویں اکائی ''میرؔ کی مرثیہ نگاری اور مرثیہ 'ایمان یہ کیسا تھا کیسی یہ مسلمانی' کی تدریس وتفہیم''، نویں اکائی ''میرؔ کی دیگر شعری اصناف کا تنقیدی جائزہ'' کے عنوان سے مخصوص کی گئی ہیں۔ یہ چاروں اکائیاں میرؔ کے ان شعری اصناف کا احاطہ کرتی ہیں جن میں وہ عمومی سطح سے مقبول ومعروف نہیں ہوئے۔ یا یہ کہہ سکتے ہیں کہ دنیائے ادب میں ان کی غزل گوئی مذکورہ دیگر شعری اصناف پر حاوی رہی۔ اس لیے خصوصاً میر کی شاعری کے سبھی صنفی تجربات کے اوصاف وامتیازات اور متن کی شمولیت مع تشریحات سے میر کی ہمہ جہتی کو واضح کیا گیا ہے، تاکہ طلبا بخوبی واقف ہوسکیں کہ میر محض غزل ہی کے شاعر نہیں، بلکہ وہ اپنے عہد کی مروجہ تمام شعری اصناف کے بھی باکمال شاعر ہیں۔ دسویں اکائی ''نکات الشعرا کا تنقیدی جائزہ'' کو محمول ہے، جس میں بالتفصیل ان کے تذکرے کی اہمیت افادیت اور معنویت کو زیر بحث لاکر ان کی فن شناسی اور شعر شناسی کو واضح کیا گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ پورا بلاک میرؔ کی مختلف النوع فکری اور فنی ہمہ جہتی سے عبارت ہے، جس کے مطالعے سے طلبا میرؔ کے مختلف شعری اصناف کی قدر وقیمت اور ان کی عظمت کو سمجھ سکیں گے۔

اکائی 6 میرؔ کی قصیدہ نگاری اور قصیدہ ''درمدح آصف الدولہ'' کی تدریس وتفہیم

ساخت

6.1 اغراض ومقاصد
6.2 تمہید
6.3 میرؔ کی قصیدہ نگاری اور قصیدہ ''درمدح آصف الدولہ'' کی تدریس وتفہیم
6.3.1 میرؔ کی قصیدہ نگاری
6.3.2 منتخب متن کی تدریس وتفہیم
6.3.3 ماحصل
6.4 آپ نے کیا سیکھا؟
6.5 اپنا امتحان خود لیجیے
6.6 سوالوں کے جوابات
6.7 فرہنگ
6.8 کتب برائے مطالعہ

6.1 اغراض ومقاصد

عزیز طلبا! اس اکائی میں آپ:

- صنف قصیدہ میں میر تقی میرؔ کے شعری سرمایے سے روشناس ہوں گے۔
- میرؔ کی قصیدہ گوئی کی خصوصیات سے واقف ہوں گے۔
- میرؔ کی قصیدہ گوئی کی قدر و قیمت جانیں گے۔
- شامل نصاب قصیدہ ''درمدح نواب آصف الدولہ'' کے متن کی قرأت کریں گے۔
- شامل نصاب قصیدہ ''درمدح نواب آصف الدولہ'' کی تشریح سے متعارف ہوں گے۔

6.2 تمہید

عزیز طلبا! پچھلے بلاک میں آپ نے پانچ اکائیوں کا مطالعہ کیا، اس بلاک کے مطالعے سے میر کے عہد کی سیاسی،

سماجی اور تہذیبی صورت حال، ان کے عہد کے شعری منظر نامے، میر کے سوانحی حالات و کوائف، خصوصاً خود نوشت ''ذکر میر'' اور ان کے نمائندہ معاصرین کے مطالعہ سے میر کی شخصیت اور ان کے عہد کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اب آپ دوسرے بلاک کی پہلی اکائی میں میر کی قصیدہ نگاری اور منتخب قصیدہ کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔ عزیز طلبا! آپ کو معلوم ہوگا کہ میر نے اردو کی دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی اور تقریباً سبھی اصناف میں اپنی انفرادیت کے نقش ثبت کیے۔ انھوں نے قصیدہ میں بھی طبع آزمائی کی لیکن اس میدان میں وہ سوداؔ سے بازی ہار گئے۔ یوں بھی قصیدے کے میدان میں سودا سے مقابلہ کوئی آسان بات نہیں، اس کے باوجود اس پورے عہد میں میر نے اس رتبے کے قصیدے کہے کہ ان سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اس اکائی میں جہاں میر کے قصیدے ''در مدح نواب آصف الدولہ بہادر'' کا انتخاب اور اس کی تشریح پیش کی گئی ہے وہیں موضوع کی مناسبت سے میر کی قصیدہ گوئی کے حسن و قبح پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ اکائی میر کے شاعرانہ مرتبے اور صنف قصیدہ کے میدان میں ان کی خوبیوں کی تعیین میں آپ کی مدد کرے گی۔

6.3 میرؔ کی قصیدہ نگاری اور قصیدہ ''در مدح آصف الدولہ'' کی تدریس و تفہیم

6.3.1 میرؔ کی قصیدہ نگاری

میر نے کل آٹھ قصیدے کہے۔ ان میں تین قصیدے حضرت علیؑ کی مدح میں، ایک حضرت حسینؑ کی مدح میں، ایک قصیدہ مغل بادشاہ شاہ عالم کی مدح میں اور دو قصیدے نواب آصف الدولہ کی مدح میں کہے۔ ان قصیدوں میں میر نے تشبیب، گریز، مدح اور دعا کا التزام کیا ہے۔ البتہ قصیدہ ''در شکایت نفاق یاران زماں'' میں قصیدے کے ان معروف اجزا کا التزام نہیں کیا گیا ہے۔ ذیل میں قصائد میر کے مطلعے درج کیے جاتے ہیں:

جب سے خورشید ہوا ہے چمن افروز حمل
رنگ گل جھمکے ہے ہر پات ہرے کے اوجھل

(در مدح حضرت علی مرتضیٰؑ)

اک شب کیا تھا یار تری زلف کا خیال
اب تک ہے دشمنی میں مری میرا بال بال

(در مدح حضرت علی مرتضیٰؑ)

غنچے ہو دل پر آتے ہیں اندوہ اب مدام
پہنچے ہے مجھ کو داغ گل جنگ صبح و شام

(در مدح حضرت علی مرتضیٰؑ)

فلک کے جور و جفا نے کیا ہے مجھ کو شکار
ہزار کوس پہ ہے جاے اک تپیدن وار

(درمدح حضرت امام حسینؑ)

جو پہنچی قیامت تو آہ و فغاں ہے
مرے ہاتھ میں دامن آسماں ہے

(درمدح بادشاہ جم جاہ، خاور سپاہ، شاہ عالم بادشاہ)

ہوا کیے ہیں زبس شکوۂ فلک تحریر
سیہ ہے کاغذ مشقی کے رنگ لوح ضمیر

(درمدح نواب آصف الدولہ بہادر)

رات کو مطلق نہ تھی یاں جی کو تاب
آشنا ہوتا نہ تھا آنکھوں سے خواب

(درمدح نواب آصف الدولہ بہادر)

جہاں میں کون ہے جس کو کسی سے الفت ہے
خراب کوچہ و بازار یاں محبت ہے

(درشکایت نفاق یاران زماں)

میر نے اپنے قصائد کے لیے وہی زمینیں استعمال کی ہیں جو فارسی قصیدہ گو شعرا اور اردو میں مرزا محمد رفیع سودا کے یہاں بھی مستعمل ہیں۔ بہار یہ تشبیب کے مضامین بھی وہی ہیں جو فارسی شعرا اور سودا کے یہاں ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر کے پیش نظر بھی فارسی قصائد کا معیار تھا۔ عام طور پر قصیدے میں دیگر اصناف کے بالمقابل زبان زیادہ پرزور، بلند آہنگ اور پرشکوہ ہوا کرتی تھی، کیوں کہ اس میں مختلف علوم وفنون کی کارفرمائی اور ان کی اصطلاحوں کا استعمال بھی ہوا کرتا تھا۔ قصیدے میں شاعر کی زورِ طبع، علم وفضل اور متخیلہ کا اصل امتحان ہوتا ہے۔ اسی لیے اس صنف میں شاعر کو اپنے شاعرانہ کمالات کے اظہار کا موقع بہت کھل کر ملتا ہے۔ وہ مدح کے بہانے اپنے شاعرانہ کمالات کا اظہار کرتا ہے۔ اپنے اسلوب بیان کی وجہ سے قصیدے کے اشعار عام طور پر مضمون آفرین ہوتے ہیں۔ شاعر جب بھی تشبیب کے موضوعات، مدح اور دعا کے مضامین باندھتا ہے تو گویا انھیں مضامین کو بار بار ہر قصیدے میں دوہراتا ہے اور ہر بار اس میں کوئی نہ کوئی نیا پہلو، نیا انداز بیان، نئی لفظیات کا استعمال کرتا ہے۔ مضمون آفرینی کا عمل انھیں راہوں سے ممکن ہوتا ہے۔ محمد حسین آزاد نے میر کے قصیدوں کو درجے میں کم قرار دیا ہے۔ وہ دقیق مطالب، مضامین کی بلند پروازی، الفاظ کی شان وشکوہ، بندش کی چستی کو قصائد کا لازمہ قرار دیتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ قصیدہ گوئی کے لیے طبیعت کی شگفتگی اور جوش وخروش

بھی درکار ہے۔ ظاہر ہے میر کے قصائد میں یہ عناصر خال خال ہی ملتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ میر نے تخیل کی پرواز اور مبالغے کا استعمال نہیں کیا ہے، البتہ مضامین کو نظم کرنے میں ان کے یہاں وہ زور اور قوت بیان نہیں ہے جو دیگر معروف قصیدہ گو شعرا کا اختصاص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قصائد میں وہ بلندی اور شان مفقود ہے جس کی توقع قصیدے سے کی جاتی ہے۔

میر کے قصیدوں میں بھی غزلوں کی طرح کی اثر آفرینی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ عام طور پر ان کے قصیدوں کی تشبیب غزل کی مخصوص فضا سے معمور رہتی ہے۔ ان کے قصیدے کی زمینیں مشکل نہیں ہوتیں اور نہ ہی دھوم دھام کی تشبیب ہوتی ہے۔ ان کی تشبیب میں بالعموم خیال بندی اور تخیل کی بلند پروازی کے بجائے کیفیت اور شورانگیزی کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ اس پہلو پر دھیان دیا جائے تو یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ میر نے اپنے قصائد میں خیال بندی کے بجائے کیفیت اور شورانگیزی کے اسلوب کو برتنے کی کوشش کی اور اس طرح قصیدے کے اسلوب میں نئی طرح ڈالنے کی کوشش کی۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ خیال بندی کا اسلوب قصیدے کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ یہ اسلوب فارسی اور اردو غزل کا بھی مقبول اور مرغوب اسلوب ہے۔ فارسی اور اردو کے کئی اہم اور استاد شعرا اسی رنگ کو اپنا کر شعر وسخن کی دنیا پر اپنی مہر ثبت کر گئے۔ میر لفظوں کا استعمال بھی اس انداز سے کرتے ہیں کہ قصیدے کی بلند آہنگی کے بجائے غزل کی شان باقی رہتی ہے۔ جہاں انھوں نے روایتی قصیدوں کا تتبع کیا وہاں اپنی استادی کی چھاپ بھی چھوڑی۔ میر نے بڑی پر لطف بہاریہ تشبیبیں کہی ہیں۔ ذیل میں ان کی عاشقانہ تشبیب سے تین مثالیں ملاحظہ کیجیے۔

(پہلی مثال)

اک شب کیا تھا یار تری زلف کا خیال
اب تک ہے دشمنی میں مری میرا بال بال

میں مرگیا فراق میں پر اب یہ کیا ہے ظلم
جیتی گڑی ہے ساتھ مرے حسرت وصال

حیرت بسا ہی جان کو اپنی تمام عمر
ٹک چشم آئینہ نے ترا دیکھ کر جمال

یک روز بے نقاب ہوا تھا تو صبح کو
اب تک ہے آفتاب جہاں تاب پر زوال

(دوسری مثال)

اے کج روش تو نامہ نہ لکھ، بھیج مت پیام
قاصد کا میرے سیدھی طرح سے تو لے سلام

دل میں نہیں ہے قطرۂ خوں آنکھیں ہیں گی تر
خالی پڑا ہے شیشۂ مے بھر رہے ہیں جام

ناکامیوں سے کام رکھا میں تمام عمر
گو کام دل حصول نہ ہو مجھ کو کیا ہے کام

آنکھوں سے اس کی چشم وفا میرؔ ہے غلط
وحشی ہیں یہ غزال نہ ہوں گے کسی سے رام

(تیسری مثال)

فلک کے جور و جفا نے کیا ہے مجھ کو شکار
ہزار کوس پہ ہے جاے اک تپیدن وار

جنوں میں جب سے خوش آیا لباس عریانی
نہیں ہے دامن صحرا میں تب سے مجھ کو قرار

عجب ہے مجھ کو جو تو دیکھنے نہیں آتا
رہا ہوں ایک تری انکھڑیوں کا میں بیمار

میر کی قصیدہ نگاری کے تعلق سے اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ میر نے بہت کم قصیدے کہے۔ اتنے کم قصیدوں کی روشنی میں میر کی قصیدہ نگاری پر کوئی حکم لگانا یا رائے قائم کرنا قدرے مشکل ہے۔ ہمیں یہ بھی دھیان رکھنا چاہیے کہ ید بیضا ایک معجزہ ہونے کے باوجود پانچوں انگلیاں برابر نہیں رکھتا۔ میر نے سودا کی زمین میں بھی قصیدے لکھے ہیں۔ گویا ایک طرح سے انھیں سودا سے مقابلہ تھا۔ سودا کا مشہور قصیدہ ''اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل'' یاد کیجیے اور پھر اسی زمین میں میر کے قصیدے سے درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

جب سے خورشید ہوا ہے چمن افروز حمل
رنگ گل جھمکے ہے ہر پات ہرے کے اوجھل

چشم رکھتا ہے تو چل فیض ہوا کو ٹک دیکھ
نرگس اگتی ہے جہاں بوئی تھی دہقاں نے بصل

لطف روئیدگی مت پوچھ کہ میں شبہے میں ہوں
سبزہ غلطاں ہے لب جو پہ کہ خواب مخمل

برگ گل فیض ہوا کرتا ہے ہر اخگر کو
آگ کی گر کہیں سلگا کے رکھیں ہیں منقل

درج بالا اشعار میں مبالغہ بھی ہے اور تشبیہہ کی ندرت بھی۔ تشبیہات کے ذریعے بہار کی منظر کشی خیالی سے زیادہ سے حقیقی معلوم ہوتی ہے۔ میر نے اپنی تشبیب میں محاکات سے زیادہ کام لیا ہے۔ البتہ سودا سے موازنہ کیا جائے تو زور بیان میں کمی صاف محسوس ہوتی ہے۔ میر کے قصیدے ''در مدح حضرت علیؓ'' میں مبالغے کا رنگ ملاحظہ کیجیے۔

کیا لکھوں اسپ سبک سیر کی اس کے تعریف
ادہم خامہ بھی لکھتے ہوئے جاتا ہے اچھل

اس فلک سیر کا میدان مقرر ہے گا
تگ و پو کے لیے اثنائے ابد اور ازل

جان یہ ہے ترے گھوڑے میں کہ تا روز جزا
گرد کو اس کے نہ پہنچے گی کبھو اس کی اجل

اک مصور نے اسے دیکھ کے دوڑایا خیال
دیکھوں اس باد کی مجھ سے بھی سکے شکل نکل

سر و سینہ کو کمر تک تو بنایا رکھ ہاتھ
اڑ گیا صفحۂ کاغذ پہ سے چھوتے ہی کفل

درج بالا اشعار میر نے حضرت علی کے گھوڑے کی تعریف میں رقم کیے۔ اب شاہ عالم بادشاہ کا گھوڑا بھی ملاحظہ کیجیے۔

سبک سیر کی تیرے کیا کہیے جلدی
پھر اس فربہی پر کہ تخت رواں ہے

ازل سے ابد تک ہے جولاں گہ اس کی
قدم ایک یاں اک قدم اس کا واں ہے

جو اس میں سوار اس کا چاہے کہ ڈپٹے
ارادے میں اس کے ابھی حرف ہاں ہے

نہ پہنچے وہ ہونٹوں تلک اس کے ہرگز
کہ یہ باد پیما کہاں کا کہاں ہے

لگے گر کہیں ٹاپ طبق زمیں پر
فلک صدمے سے آں سوئے لامکاں ہے

درحقیقت میر غزل کے بادشاہ تھے۔ انھوں نے مثنویاں بھی منفرد انداز کی اور اپنے مزاج کے موافق لکھیں۔ انھوں نے قصیدہ گوئی میں بھی اپنی طبیعت کا زور دکھایا اور اپنے دائرے میں رہتے ہوئے ایسے قصیدے لکھے جنھیں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے قصیدوں میں ایک طرح کی دلکشی اور دلنوازی پائی جاتی ہے۔ قصیدہ نگاری میں سودا کا مقابلہ شاید ہی کسی قصیدہ نگار سے ہو، میر سودا کے ہم عصر تھے۔ میر کے قصائد کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ میر وسودا کے زمانے میں بہت سے شعرا نے قصائد لکھے لیکن اس عہد میں سودا کے بعد جس شاعر کے قصیدے متوجہ کرتے ہیں وہ میر ہی ہیں۔

6.3.2 منتخب متن کی تدریس وتفہیم

عزیز طلبا! آیئے اب ہم شامل نصاب میر تقی میرؔ کے قصیدے کی قرأت کرتے ہیں:

درمدح نواب آصف الدولہ بہادر

رات کو مطلق نہ تھی یاں جی کو تاب — آشنا ہوتا نہ تھا آنکھوں سے خواب
لوٹتا تھا سوز غم سے آگ میں — دل جگر سنکتے تھے دونوں جوں کباب
ہر زماں تھی ساتھ اپنے گفتگو — کیا کروں شہر اور میں دونوں خراب
تھا کرم شیوہ جنھوں کا اٹھ گئے — بیٹھے بیٹھے کھینچیے کب تک عذاب
جایئے کس کے در اوپر کون ہے — ملیے کس سے کون ملنے کا ہے باب ۵
لے جوانی سے پھرے پیری تلک — امتحاں میں آگئے سب شیخ و شاب
ناگہاں مجھ سے لگا کہنے سروش — رہ گذر سے لطف کی کر کر خطاب
ہے کریم اب بھی وزیر ابن وزیر — آصف الدولہ فلک قدر و جناب

آسماں رتبہ ہے جس کا آستاں
ناز کر طالع پہ جو ہو باریاب

اس کی ہمت سے سخن کیا سر کروں
بات کہتے دے دُر و یاقوت ناب

اس کے دست و دل کے رشک و شرم سے
خون ہے دل کان کا دریا ہے آب

جم حشم انجم سپہ گردوں شکوہ
مرجع خرد و کلاں عالم مآب

دست ہمت اس کا گر دربار ہو
پانی پانی شرم سے ہووے سحاب

مال کیا ہے ہفت گنج خسروی
اک ہی کو نوّاب بخشے ہے شتاب

فخر سام و رستم اس کی بندگی
داخل خدام یاں افراسیاب

جس سحر جرأت سے کھینچی ان نے تیغ
ڈھال رکھے منہ پہ نکلا آفتاب

رزم کے عرصے میں ہلچل پڑگئی
آسماں کے خیمے کی کانپی طناب

مدعی گر کوہ تھا مارا اکھاڑ
ور زمیں تھا بے سکوں پایا شتاب

خرمن آسا جل گیا انبوہ خصم
چل پڑی جو اس کی تیغ برق تاب

دیو تھے گو معرکے میں بے شمار
ایک ٹھہرا ہو مقابل کیا حساب

زین رکھا جائے مرکب پر اگر
راجا پرجا آن کر دابیں رکاب

زلزلہ پڑجائے سارے ملک میں
ملک داروں سے کہیں ہاں سر حساب

مطلع ثانی کی اب مائل ہے طبع
کفر ہے حرف و سخن سے اجتناب

مطلع ثانی

اے ترے ڈر سے جگر شیروں کے آب
دشمنوں کو روبہانہ اضطراب

مدعی کی صف ہے کونجوں کی قطار
لشکری اس فوج کا ہر اک عقاب

موجزن جیدھر ہو وہ دریائے فوج
بستیاں اس سمت کی جیسے حباب

گرد اس لشکر کی گر ہووے بلند
پھر زمین و آسماں میں ہے حجاب

جاوے دشمن جوں سگ پا سوختہ
وقت گرگ و میش لے منہ پر نقاب

داوری و منصفی سن دلبراں
چھوڑ دیں عشاق پر کرنا عتاب

رفع بدعت چاہے تو پھر کیا مجال
اٹھ سکے جو نغمۂ چنگ و رباب

منع مے ہووے تو پھر قدرت ہے کیا
جو گلے سے شیشے کے اترے شراب

بحر کیا ہے جو کرے تہ سے سوال
کوہ تیرے حلم کا کیا دے جواب

خوبیاں ہی خوبیاں سر تا قدم
تب کیا صانع نے تجھ کو انتخاب

لطف طبع صاحب مجلس کہوں
یا لکھوں پاکیزہ اس صحبت کا داب

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

نکلی مستعمل نہایت ورنہ شب ۳۵ چاندنی کی جاے بچھتی ماہتاب
گر نہ ہو ممدوح علم ظاہری پُر نہیں ہوتی ہے یہ رائے صواب
جو کہے تو چاہیے وہ لکھ رکھیں حرف ہر یک تیرے منھ کا ہے کتاب
کر دعا پر میرؔ اب ختم سخن تو کہے جو کچھ کرے حق مستجاب
زیر دست اس کے رہیں گردن کشاں تا قیامت وہ رہے مالک رقاب
دوست اس کے جوش زن جیسے محیط
خاک بر سر مدعی جیسے سراب

عزیز طلبا! آپ کے نصاب میں شامل مذکورہ منتخب قصیدہ ''در مدح نواب آصف الدولہ بہادر'' کل چالیس اشعار پر مشتمل ہے۔ جس میں ابتدائی چھ اشعار تشبیب کے ہیں، ساتواں شعر گریز کا ہے، اڑتیسویں شعر میں دعا کا اعلان اور انتالیس اور چالیس نمبر کے اشعار دعائیہ ہیں۔ گویا اس قصیدے میں سب سے زیادہ تیس اشعار مدح کے ہیں۔ عام طور پر قصیدہ گو شعرا کا معمول یہ رہا ہے کہ وہ تشبیب میں اپنے فنی کمالات کا مظاہرہ زیادہ کرتے ہیں۔ انھیں تشبیب میں خیال بندی، مبالغے کا زور، علمی اور فنی اصطلاحات، علم بیان اور علم بدیع کا انتہائی مظاہرہ کرنے کا موقع زیادہ ملتا ہے۔ چوں کہ شعرا اپنی استادی، قادرالکلامی اور صناعی پر داد کے خواہاں ہوتے ہیں اس لیے تشبیب بھی خاصی طویل کہتے ہیں۔ تشبیب کے بعد مدح میں وہ مبالغے کے زور پر زیادہ انحصار کرتے ہیں۔ اس لیے مدحیہ اشعار کی بھی خاصی تعداد ہوتی ہے۔ اس قصیدے میں ہم نے ملاحظہ کیا کہ میر نے تشبیب کے محض چھ اشعار کہے ہیں اور سب سے زیادہ اشعار مدح کے ہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ تشبیب اور مدح کے ان اشعار کا فنی مرتبہ دیگر قصیدہ گو شعرا کے مقابلے میں کیا ہے، اس صورت حال سے اس تصور کی نفی ہوتی ہے جس میں قصیدے کم کہنے کا سبب میر کی افتادِ طبع اور گوشہ نشین فطرت کو بتایا جاتا ہے۔ یقیناً ان کے مزاج کو قصیدے سے نسبت نہ تھی لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اپنی تنک مزاجی کی وجہ سے کسی کی تعریف کرنے میں معذور تھے۔ اگر یہ بات مان بھی لی جائے تو یہ سوال پیدا ہوگا کہ مذہبی قصائد میں میر کو کون سا امر مانع تھا؟ بہر کیف ہم نے مذکورہ جس قصیدہ کی قرأت کی ہے اس کی تشریح و توضیح مندرج ذیل ہے:

تشریح:

شعر نمبر ایک تا چھ تشبیب کے اشعار ہیں۔ یہ تشبیب معمول سے قدرے مختلف ہے۔ اولاً تو بہت مختصر ہے، ثانیاً موضوعی اعتبار سے شہر آشوب اور ذاتی رنج معلوم ہوتی ہے۔ متکلم ساری رات بے چین رہتا ہے اور اس کی آنکھوں میں دور دور تک نیند کا کچھ نشان نہیں ملتا۔ بے چینی اور اضطراب کی حالت میں انسان بستر پر کروٹیں بدلتا

رہتا ہے۔ اس لحاظ سے دوسرے شعر میں سوزغم سے لوٹنے کی بات بہت پر لطف ہو جاتی ہے۔ اضطراب سے بار بار کروٹیں بدلنا بھٹی پر سیخ کباب سنکنے کے عمل کی تصویر بناتا ہے۔ اس بے چینی اور اضطراب کا سبب یہ ہے کہ متکلم اور اس کا شہر دونوں کی حالت دگرگوں ہو چکی ہے۔ شہر کے باکمال اور کرم شیوہ، فن کے قدردان اور مربی یا تو تباہ ہو چکے ہیں یا اس دنیا سے کوچ کر چکے ہیں۔ کوئی آشنا صورت اور مجسم مہر و مروت باقی نہیں رہا۔ کوئی ایسا نہیں جس کے پاس متکلم اپنا غم غلط کر سکے۔ یہ حال صرف متکلم کا نہیں بلکہ ہر بوڑھے اور جوان کا ہے۔

ساتویں شعر میں مدح کی طرف گریز ہے۔ متکلم کہتا ہے کہ میں انھیں رنجوں سے چور تھا کہ اچانک ایک غیبی آواز نے مجھ سے از راہ لطف خطاب کیا اور کہا کہ وزیر ابن وزیر نواب آصف الدولہ فلک قدر اور فلک جناب اب بھی وزیر ہیں۔ یعنی نواب آصف الدولہ کے ہوتے ہوئے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

نویں شعر سے باقاعدہ مدحیہ اشعار کا آغاز ہوتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ بائیسویں شعر تک اسلوب بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ متکلم وہی ہاتف غیبی ہے جو راہ میں ملا تھا۔ مطلع ثانی اور اس کے بعد کے اشعار کا متکلم شاعر ہے۔

آسماں رتبہ ہے جس کا آستاں
ناز کر طالع پہ جو ہو باریاب

اس کی ہمت سے سخن کیا سر کروں
بات کہتے دے در و یاقوت ناب

اس کے دست و دل کے رشک و شرم سے
خون ہے دل کان کا دریا ہے آب

نواب آصف الدولہ کو آسمان رتبہ کہا ہے۔ یعنی نواب آصف الدولہ کا مرتبہ آسمان کی طرح بلند اور اعلیٰ ہے۔ اگر نواب تک باریابی ہو جائے تو انسان کو اپنی قسمت پر ناز کرنا چاہیے۔ آسماں اور آستاں میں صنعت تجنیس ہے۔ ''اس کی ہمت سے سخن کیا سر کروں''، یہاں ''ہمت سے'' کے معنی ہیں، ہمت کے بارے میں۔ یعنی اس کی فیاضی اور سخاوت کے بارے میں کیا بات کروں۔ وہ تو بات پوری بھی نہیں ہوتی اور قیمتی یاقوت اور موتی عطا کر دیتا ہے۔ اس کے کھلے ہاتھ اور دل کی وسعت سے کان کا دل رشک سے خون ہو جاتا ہے اور مارے شرم کے دریا بھی پانی پانی ہو جاتا ہے۔ یعنی دریا میں بھی اس کے دل کی سی وسعت نہیں اور کان جو کہ زر و جواہر کا منبع ہے وہ بھی نواب سے بڑھ کر سخاوت نہیں کر سکتا۔

جم حشم انجم سپہ گردوں شکوہ
مرجع خرد و کلاں عالم مآب

دست ہمت اس کا گر در بار ہو
پانی پانی شرم سے ہووے سحاب

مال کیا ہے ہفت گنج خسروی
اک ہی کو نواب بخشے ہے شتاب

وہ جمشید بادشاہ جیسی شان وشوکت، لشکر جرار اور آسمان جیسی رفعت والا ہے۔ وہ تمام عالم کی امید گاہ ہے۔ اگر اس کے فیاض ہاتھ موتی لٹانے لگیں تو بادل بھی شرم سے پانی پانی ہو جائیں۔ بادلوں سے پانی برستا ہے، پانی اور موتی میں آب یعنی چمک ہوتی ہے۔ اسی مشترک وصف کی بنا پر نواب کی درباری دیکھ کر بادلوں کے پانی پانی ہونے کا جواز پیدا ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بادل اتنا پانی نہیں برساتے جتنا نواب موتی لٹا دیتے ہیں۔ اس کی فیاضی کا یہ عالم ہے کہ مال تو مال ہے وہ تو شہنشاہی کے سات خزانے بھی پہلے ہی ریلے میں لٹا دیتا ہے۔

فخر سام و رستم اس کی بندگی
داخل خدام یاں افراسیاب

جس سحر جرأت سے کھینچی ان نے تیغ
ڈھال رکھے منھ پہ نکلا آفتاب

رزم کے عرصے میں ہلچل پڑ گئی
آسماں کے خیمے کی کانپی طناب

مدعی گر کوہ تھا مارا اکھاڑ
ور زمیں تھا بے سکوں پایا شتاب

ان اشعار میں شاعر نے ممدوح کے دست و بازو اور اس کی ہمت و دلاوری کی تعریف مبالغے کے ساتھ کی ہے۔ ممدوح اگر بادشاہ، نواب یا امیر ہے تو تقریباً تمام قصیدہ گو شعرا اس کی قوت اور توانائی کا ذکر سام، رستم اور افراسیاب کے ساتھ کرتے ہیں۔ میر نے ممدوح کی ہمت اور بہادری کو صرف سام اور رستم جیسے نامی پہلوانوں سے تشبیہ ہی نہیں دی بلکہ ان کو ممدوح کی بندگی میں ثابت کرنے پر بھی اکتفا نہیں کیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان مشہور عالم پہلوانوں کو بندگی کی اس نسبت پر فخر بھی ہے۔ ممدوح کے خدمت گاروں میں افراسیاب جیسے جاہ و حشم

والے بادشاہ شامل ہیں۔ جب ممدوح صبح کے وقت اپنی تلوار میان سے نکالتا ہے تو اس کی آب و تاب کے آگے سورج کو بھی حیا آتی ہے اور منھ پر ڈھال رکھ کر نکلتا ہے یعنی منھ چھپا کر نکلتا ہے۔ یہاں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ سورج ممدوح کی تلوار کے وار سے خود کو بچانے کے لیے احتیاطاً ڈھال رکھ کر نکلتا ہے۔ ممدوح کا تلوار کھینچنا تھا کہ رزم گاہ میں افراتفری مچ گئی حتیٰ کہ آسمان کے خیمے کی طناب بھی کانپنے لگی اس میں بھی لرزہ آ گیا۔ ہلچل کی مناسبت سے کانپی کا لفظ نہایت مناسب ہے۔ ''آسمان کے خیمے کی کانپی طناب'' میں حسن تعلیل بھی ہے۔ دشمن اگر پہاڑ کی طرح تھا اسے ایسے پست کر دیا جیسے اکھاڑ کر پھینک دیا ہو اور اگر زمین کی طرح پرسکون تھا تو بے سکون ہو گیا۔ ''ورزمیں تھا'' سے معلوم ہوتا ہے کہ زمیں کو مذکر باندھا ہے لیکن ''تھا'' کا تعلق مدعی سے ہے، زمین سے نہیں۔ ''ور'' کے معنی ہیں ''اور اگر''۔

خرمن آسا جل گیا انبوہ خصم
چل پڑی جو اس کی تیغ برق تاب

دیو تھے گو معرکے میں بے شمار
ایک ٹھہرا ہو مقابل کیا حساب

شاعر کہتا ہے کہ ممدوح چمک اور تیزی میں بجلی جیسی اپنی تلوار سے دشمن پر حملہ آور ہو تو دشمن کی بھیڑ پل بھر میں خاکستر ہو جائے جیسے گھاس پھوس جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی تلوار سے ایسے جھپٹ جھپٹ کر حملہ کرتا ہے کہ دیو جیسے بے حساب دشمن مقابلے کی تاب نہ لا کر راہ فرار اختیار کرتے ہیں یا ہلاک ہو جاتے ہیں۔

زین رکھا جائے مرکب پر اگر
راجا پرجا آن کر دابیں رکاب

زلزلہ پڑ جائے سارے ملک میں
ملک داروں سے کہیں ہاں سر حساب

مطلع ثانی کی اب مائل ہے طبع
کفر ہے حرف و سخن سے اجتناب

ان اشعار میں شاعر نے ممدوح کے گھوڑے کی تعریف کی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ممدوح کی سواری ایسی تیز رفتار ہے کہ زین رکھتے ہی دوڑ پڑتی ہے۔ اس لیے اس جم حشم ممدوح کی سواری پر جب زین رکھی جاتی ہے تو اس کی رعیت میں شامل راجا اور پرجا سبھی آ کر اس کی رکاب سنبھالتے ہیں کہ کہیں پل میں نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ جب

وہ مرکب دوڑتا ہے تو اس کی دھمک سے سارا ملک ہلنے لگتا ہے اور ملک داروں سے ہوشیار اور خبر دار رہنے کے لیے کہہ دیا جاتا ہے۔ آخری شعر میں مطلع ثانی کی اطلاع دی گئی ہے اور یہ جواز دیا گیا ہے کہ ایسے ممدوح کی تعریف میں الفاظ سے اجتناب کفر کے درجے میں شامل ہے۔ یہاں یہ پہلو بھی دلچسپ ہے کہ جب ممدوح کے ہاتھ اس قدر کھلے ہیں کہ وہ باتوں باتوں میں کیجیے ہفت گنج خسروی بھی نچھاور کر دیتا ہے تو ایسے ممدوح کی مدح نہ کرنا کفران نعمت ہے۔

اے ترے ڈر سے جگر شیروں کے آب
دشمنوں کو روبہانہ اضطراب

مدعی کی صف ہے کونجوں کی قطار
لشکری اس فوج کا ہر اک عقاب

موج زن جیدھر ہو وہ دریائے فوج
بستیاں اس سمت کی جیسے حباب

گرد اس لشکر کی گر ہووے بلند
پھر زمین و آسماں میں ہے حجاب

جاوے دشمن جوں سگ پاسوختہ
وقت گرگ و میش لے منھ پر نقاب

ممدوح کے رعب و دبدبے سے شیر بھی ڈرتے ہیں اور دشمنوں کو مکار لومڑی کی طرح اضطراب ہونے لگتا ہے۔ اس کے لشکر کا ہر ایک سپاہی عقاب کی مانند ہے اور جب وہ دشمن پر جھپٹتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دشمن فوجوں کی سپاہ قاز نامی پرندوں کی قطار ہے۔ اس کا عظیم الشان لشکر ٹھاٹھیں مارتا دریا نظر آتا ہے اور وہ جس سمت پیش قدمی کرتا ہے، اس سمت کی بستیاں لشکر کے درمیان ایسے نظر آتی ہیں جیسے پانی کا بلبلہ۔ اس کے لشکر کی گرد اتنی کثیر اور کثیف ہے کہ جب وہ بلند ہوتی ہے تو آسمان سے زمین اور زمین سے آسمان دکھائی نہیں دیتا گویا ان دونوں نے ایک دوسرے سے پردہ کر لیا ہو۔ دشمن اس کے لشکر کی طرف اگر تیزی سے پیش قدمی کرے تو عین جنگ کے وقت منھ چھپا لے یعنی راہ فرار اختیار کر لے۔

داوری و منصفی سن دلبراں
چھوڑ دیں عشاق پر کرنا عتاب

شاعر کہتا ہے کہ ممدوح کا انصاف اور عدل ایسا مثالی ہے کہ اس کے بارے میں سن کر معشوق بھی عشاق پر ظلم وستم اور بے التفاتی کرنا ترک کردے۔ داوری اور منصفی کی تعریف کے لیے میر نے بالکل نیا پیرایۂ اظہار اپنایا ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ میر نے یہاں غزل کی رسومیاتی اور تصوراتی دنیا سے فائدہ اٹھایا ہے۔ غزل کی دنیا میں معشوق کا کردار جس طرح سامنے آیا ہے اس کے مطابق معشوق سے زیادہ ظالم اور عشاق سے زیادہ لاچار اور مجبور کوئی وجود نہیں۔ ظلم معشوق کی ایسی فطرت ہے جو چاہ کر بھی نہیں بدلتی لیکن ممدوح کا عدل وانصاف ایسا مثالی ہے کہ معشوق اپنی اس فطرت سے باز آجائے۔ غزل کی تصوراتی دنیا سے استفادے کے باعث مبالغے کی شدت اور ندرت کا احساس نہیں ہوتا۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ میر نے امکان کا ایک نیا میدان فراہم کر دیا تھا۔

6.3.3 ماحصل

کلام میر کے بارے میں بالخصوص غزلوں کے حوالے سے آپ بیتی میں جگ بیتی، سادگی، سہل ممتنع، واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ کا وصف اس قدر دوہرایا گیا کہ گویا میر کو بیان وبدیع کی جملہ خوبیوں سے کوئی گریز ہے، ان کے یہاں لفظی جادوگری، رعایت لفظی اور مناسبات معنوی کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس لیے ان کی شاعری سچی شاعری ہے۔ حالاں کہ میر کی غزلوں میں اسلوب اور لہجے کا اس قدر تنوع ہے کہ مذکورہ عناصر کو ہی میر کی شاعری سے خاص سمجھنا قرین انصاف نہیں۔ لیکن میر کے بارے میں مذکور امور کی اس قدر شہرت ہوئی کہ ان کا سارا کلام مع مثنوی اور قصیدہ اسی روشنی میں پڑھا اور سمجھایا گیا۔ ان کی قصیدہ نگاری میں بھی انھیں اوصاف کو تلاش کرنے اور مستحکم کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہاں تک کہ زمانے کے مذاق شعری کو بھی موردالزام ٹھہرایا گیا۔ یعنی زمانے کا مذاق شعری درست ہوتا تو میر تقی میر، مرزا محمد رفیع سودا سے بھی بڑے قصیدہ گو کہلاتے۔ لیکن میر کی قصیدہ گوئی اور منتخبہ متن کے مطالعے سے ہم نے پایا کہ:

ا۔ عہد میر وسودا میں سودا کے بعد قصیدے کا کوئی قابل ذکر شاعر ہے تو وہ میر تقی میر ہیں۔ میر تقی میر کو یہ مقام انھیں معیاروں، پیمانوں اور شعری تصورات پر حاصل ہے جن پر سودا کے قصائد کو پرکھا جاتا ہے۔ یہ معیارات و تصورات اسی ادبی معاشرے سے اخذ کیے گئے ہیں جن کے تحت صنف قصیدہ متشکل ہوئی اور پروان چڑھی۔

۲۔ میر کو نہ تو مبالغے سے کوئی بیر ہے اور نہ ہی وہ تخیل کی پرواز سے کوئی پرہیز کرتے ہیں۔

۳۔ میر نے بھی مبالغے اور خیال کی پرواز میں زور طبع دکھانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

6.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- میر تقی میرؔ کے قصائد کی تعداد اور ان کے ممدوحین سے واقفیت حاصل کی۔

- میر تقی میر کی قصیدہ گوئی کی خصوصیات سمجھیں۔
- قصیدہ گوئی میں میر تقی میر کے مقام و مرتبے سے آگہی حاصل کی۔
- شامل نصاب قصیدہ ''درمدح آصف الدولہ'' کے متن کی قرأت کی۔
- شامل نصاب قصیدہ کی تشریح و توضیح سمجھی۔

6.5 اپنا امتحان خود لیجیے

ا۔ میر کے قصیدوں کی تعداد اور ان کے ممدوحین کے نام بتائیے۔

۲۔ قصیدہ گوئی میں میر کی انفرادیت پر روشنی ڈالیے۔

۳۔ حضرت علی کے گھوڑے کی تعریف میں میر کے قصیدے سے مبالغے کے اشعار نقل کیجیے۔

۴۔ قصیدہ ''درمدح نواب آصف الدولہ بہادر'' پندرہ تا اٹھارہ اشعار کی تشریح کیجیے۔

۵۔ قصیدہ ''درمدح نواب آصف الدولہ بہادر'' کے آخری شعر کو درج کیجیے۔

6.6 سوالوں کے جوابات

ا۔ میر نے کل آٹھ قصیدے کہے۔ ان میں تین قصیدے حضرت علیؓ کی مدح میں، ایک حضرت حسینؓ کی مدح میں، ایک قصیدہ مغل بادشاہ شاہ عالم کی مدح میں اور دو قصیدے نواب آصف الدولہ کی مدح میں کہے۔ ان قصیدوں میں میر نے تشبیب، گریز، مدح اور دعا کا التزام کیا ہے۔ البتہ قصیدہ ''در شکایت نفاق یاران زماں'' میں میر نے قصیدے کے اجزائے ترکیبی کا التزام نہیں کیا ہے۔

۲۔ محمد حسین آزاد نے میر کے قصیدوں کو درجے میں کم قرار دیا ہے۔ وہ دقیق مطالب، مضامین کی بلند پروازی، الفاظ کی شان و شکوہ، بندش کی چستی کو قصائد کا لازمہ قرار دیتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ قصیدہ گوئی کے لیے طبیعت کی شگفتگی اور جوش و خروش بھی درکار ہے۔ ظاہر ہے میر کے قصائد میں یہ عناصر خال خال ہی ملتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ میر نے تخیل کی پرواز اور مبالغے کا استعمال نہیں کیا ہے، البتہ مضامین کو نظم کرنے میں ان کے یہاں وہ زور اور قوت بیان نہیں ہے جو دیگر معروف قصیدہ گو شعرا کا اختصاص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قصائد میں وہ بلندی اور شان مفقود ہے جس کی توقع قصیدے سے کی جاتی ہے۔ میر کے قصیدوں میں بھی غزلوں کی طرح کی اثر آفرینی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ عام طور پر ان کے قصیدوں کی تشبیب غزل کی مخصوص فضا سے معمور رہتی ہے۔ ان کے قصیدے کی زمینیں مشکل نہیں ہوتیں اور نہ ہی دھوم دھام کی تشبیب کہی۔ ان کی تشبیب میں بالعموم خیال بندی اور تخیل کی بلند پروازی کے بجائے کیفیت اور شور انگیزی کا رنگ

نمایاں نظر آتا ہے۔ اس پہلو پر دھیان دیا جائے تو یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ میر نے اپنے قصائد میں خیال بندی کے بجائے کیفیت اور شورانگیزی کے اسلوب کو برتنے کی کوشش کی اور اس طرح قصیدے کے اسلوب میں نئی طرح ڈالنے کی کوشش کی۔ میر نے اپنی تشبیب میں محاکات سے زیادہ کام لیا ہے۔ میر لفظوں کا استعمال بھی اس انداز سے کرتے ہیں کہ قصیدے کی بلند آہنگی کے بجائے غزل کی شان باقی رہتی ہے۔

۳۔ حضرت علی کے گھوڑے کی مبالغہ آمیز تعریف پر مبنی اشعار:

اس فلک سیر کا میدان مقرر ہے گا
تگ و دو کے لیے اثنائے ابد اور ازل

جان یہ ہے ترے گھوڑے میں کہ تا روز جزا
گرد کو اس کے نہ پہنچے گی کبھو اس کی اجل

اک مصور نے اسے دیکھ کے دوڑایا خیال
دیکھوں اس باد کی مجھ سے بھی سکے شکل نکل

سر و سینہ کو کمر تک تو بنایا رکھ ہاتھ
اڑ گیا صفحۂ کاغذ پہ سے چھوتے ہی کفل

۴۔ ان اشعار میں شاعر نے ممدوح کے دست و بازو اور اس کی ہمت و دلاوری کی تعریف مبالغے کے ساتھ کی ہے۔ ممدوح اگر بادشاہ، نواب یا امیر ہے تو تقریباً تمام قصیدہ گو شعرا اس کی قوت اور توانائی کا ذکر سام، رستم اور افراسیاب کے ساتھ کرتے ہیں۔ میر نے ممدوح کی ہمت اور بہادری کو صرف سام اور رستم جیسے نامی پہلوانوں سے تشبیہ ہی نہیں دی بلکہ ان کو ممدوح کی بندگی میں ثابت کرنے پر بھی اکتفا نہیں کیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان مشہورِ عالم پہلوانوں کو بندگی کی اس نسبت پر فخر بھی ہے۔ ممدوح کے خدمت گاروں میں افراسیاب جیسے جاہ و حشم والے بادشاہ شامل ہیں۔ جب ممدوح صبح کے وقت اپنی تلوار میان سے نکالتا ہے تو اس کی آب و تاب کے آگے سورج کو بھی حیا آتی ہے اور منہ پر ڈھال رکھ کر نکلتا ہے یعنی منھ چھپا کر نکلتا ہے۔ یہاں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ سورج ممدوح کی تلوار کے وار سے خود کو بچانے کے لیے احتیاطاً ڈھال رکھ کر نکلتا ہے۔ ممدوح کا تلوار کھینچنا تھا کہ رزم گاہ میں افراتفری مچ گئی حتیٰ کہ آسمان کے خیمے کی طناب بھی کانپنے لگی اس میں بھی لرزہ آ گیا۔ ہلچل کی مناسبت سے کانپی کا لفظ نہایت مناسب ہے۔ ''آسمان کے خیمے کی کانپی طناب'' میں حسن تعلیل بھی ہے۔ دشمن اگر پہاڑ کی طرح تھا اسے ایسے پست کر دیا جیسے اکھاڑ کر پھینک دیا ہو۔ اور اگر زمین کی طرح پر سکون تھا تو بے سکون ہو گیا۔ ''ور زمیں تھا'' سے معلوم ہوتا ہے کہ زمیں کو مذکر باندھا ہے لیکن

''تھا'' کا تعلق مدعی سے ہے، زمین سے نہیں۔ ''ور'' کے معنی ہیں ''اور اگر''۔

۵۔ قصیدہ کا آخری شعر:

دوست اس کے جوش زن جیسے محیط
خاک پر سر مدعی جیسے سراب

6.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
شیخ و شاب	:	بوڑھے اور جوان
سروش	:	فرشتہ، ہاتفِ غیبی
فلک قدر	:	آسمان کا رتبہ رکھنے والا، نہایت بلند مرتبہ، نہایت عالی مرتبت
جناب	:	چوکھٹ، آستانہ
ادہم	:	سیاہ رنگ کا گھوڑا
ادہم خامہ	:	سیاہ رنگ کا قلم
بَصَل	:	پیاز
ناب	:	خالص
جم حشم	:	جم یعنی ایرانی بادشاہ جمشید جیسی حشمت والا
مرجعِ خرد و کلاں	:	چھوٹے بڑے جس کی طرف رجوع کریں، امید گاہ انام
عالم مآب	:	مخلوق کی واپسی کا مرکز، امید گاہ انام، دنیا کا سہارا
طناب	:	رسی
انبوہِ خصم	:	دشمنوں کی بھیڑ، یعنی دشمنوں کی کثرت
خرمن آسا	:	کھلیان کی طرح

روبہانہ	:	روباہ کے معنی ہیں لومڑی، لومڑی کی طرح بزدلانہ
کونجوں	:	کونج کی جمع، قاز، ایک آبی پرندہ، مرغابی
سگِ پا سوختہ	:	ایسا کتا جس کے پیر جلے ہوں
وقتِ گرگ و میش	:	لڑائی کے وقت، گرگ یعنی بھیڑیا، میش یعنی بھیڑ
گردن کشاں	:	سرکش لوگ
رقاب	:	رقبہ کی جمع، رقبہ کا مطلب ہے گردن
مستجاب	:	قبول
سراب	:	ریگستان میں پانی کی طرح چمکتی ہوئی ریت

6.8 کتب برائے مطالعہ

ا۔	انتخاب قصائد اردو	:	ابو محمد سحر
۲۔	اردو میں قصیدہ نگاری	:	ابو محمد سحر
۳۔	اردو قصیدہ نگاری	:	ام ہانی اشرف
۴۔	اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ	:	محمود الہٰی
۵۔	کلیات میر (جلد دوم)	:	مرتبہ احمد محفوظ

اکائی 7 میرؔ کی مثنوی نگاری اور مثنوی ''دریائے عشق'' کی تدریس وتفہیم

ساخت

7.1 اغراض ومقاصد

7.2 تمہید

7.3 میرؔ کی مثنوی نگاری اور مثنوی ''دریائے عشق'' کی تدریس وتفہیم

7.3.1 میرؔ کی مثنوی نگاری

7.3.2 منتخب متن کی تدریس وتفہیم

7.3.3 ماحصل

7.4 آپ نے کیا سیکھا؟

7.5 اپنا امتحان خود لیجیے

7.6 سوالوں کے جوابات

7.7 فرہنگ

7.8 کتب برائے مطالعہ

7.1 اغراض ومقاصد

عزیز طلبا! اس اکائی میں آپ:

- میرؔ کی مثنوی نگاری سے متعارف ہوں گے۔
- میرؔ کی مثنویوں کے محاسن ومعائب سے آگاہ ہوں گے۔
- میرؔ کی مثنویوں کے مقام ومرتبے سے واقف ہوں گے۔
- شاملِ نصاب مثنوی ''دریائے عشق'' کے منتخب متن کی قرأت کریں گے۔
- شاملِ نصاب مثنوی ''دریائے عشق'' کی تشریح سے روشناس ہوں گے۔

7.2 تمہید

عزیز طلبا! گذشتہ اکائی میں آپ نے میر تقی میرؔ کی قصیدہ نگاری کا مطالعہ کر کے یہ معلومات حاصل کی کہ انھوں نے غزل کے علاوہ عمدہ قصائد بھی لکھے ہیں، جس میں ایک مربوط فکر وفن موجود ہے۔ فکری اور فنی سطح سے سودا کے بعد میر قصیدہ گوئی میں ایک مخصوص شناخت رکھتے ہیں۔ اب آپ زیر نظر اکائی میں میر کی مثنوی نگاری کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔ غزلوں کے علاوہ مثنوی نگاری میں بھی میر نے اپنی استادی اور قادر الکلامی کے نقش ثبت کیے

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

ہیں۔ میر کے ساتھ ستم ظریفی یہ رہی کہ ان کی غزلوں نے ان کی مثنویوں کو مشہور نہیں ہونے دیا۔ ان کی مثنویوں میں جذبات کی عکاسی، دردمندی اور اثر پذیری کی قوت نے بحیثیت مثنوی نگار ان کے نام کو زندہ رکھا ہے۔ مثنوی خواب وخیال، مورنامہ، درہجو خانۂ خود، شعلۂ شوق، شکارنامہ، تسنگ نامہ اور دریائے عشق کو خاصی شہرت حاصل ہوئی۔ لہٰذا یہاں آپ میر کی مثنوی نگاری اور ان کی مشہور مثنوی ''دریائے عشق'' کے متن کی قرأت اور اس کی تشریح وتوضیح سے استفادہ کریں گے۔ نیز ساتھ ہی ساتھ میر کی مثنوی نگاری کی ادبی صورت حال سے بھی واقف ہوں گے۔

7.3 میرؔ کی مثنوی نگاری اور مثنوی ''دریائے عشق'' کی تدریس وتفہیم

7.3.1 میرؔ کی مثنوی نگاری

میر تقی میر کا شمار اردو کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کے سرمایۂ سخن میں متفرق اصناف اور ہیئتوں کے علاوہ غزل، قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی جیسی اہم کلاسیکی اصناف شامل ہیں۔ غزل گوئی کے اعتبار سے وہ خدائے سخن کے مرتبے پر فائز ہیں۔ ان کی مثنوی نگاری کا انداز منفرد ہے۔ ان کی مثنویوں کے موضوعات ومضامین بھی بالکل جدا ہیں۔ انھیں فن شعر پر قدرت حاصل تھی۔ میر نے محض صنفی تجربہ کی بنیاد پر مثنویاں نہیں کہیں بلکہ ان کے خزانے میں اڑتیس (۳۸) مثنویاں شامل ہیں۔ ان مثنویوں کے موضوعات بھی مختلف ہیں۔ اگر میر کی مثنویوں کی زمرہ بندی کی جائے تو انھیں آٹھ زمروں کے تحت رکھا جاسکتا ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ عاشقانہ : شعلۂ عشق، دریائے عشق، معاملات عشق، جوش عشق، اعجاز عشق، خواب وخیال، درحال عشق، درحال افغاں پسر، مورنامہ، درحال مسافر جواں

۲۔ مدحیہ : درتعریف آغا رشید خطاط

۳۔ بہاریہ : دربیان کتخدائی نواب آصف الدولہ بہادر، درجشن ہولی وکتخدائی، دربیان ہولی، درتہنیت کتخدائی بشن سنگھ، ساقی نامہ

۴۔ ہجویہ : تسنگ نامہ، درمذمت برشگال، درہجو نااہل، درہجو شخصے، درمذمت آئینہ دار، درہجو اکول، درہجو عاقل نام، درہجو خانۂ خود (خودنوشت سوانح)، درہجو خانۂ خود کہ بہ سبب شدت باراں خراب شدہ بود

۵۔ واعظانہ : تنبیہ الجہال، دربیان دنیا، دربیان کذب

۶۔ وحوشیہ : دربیان مرغ بازاں، کپی کا بچہ، موہنی بلی، درتعریف سگ وگربہ، دربیان بز، مرثیۂ خروس، اژدر نامہ

۷۔ شکارنامہ : شکارنامۂ اول، شکارنامۂ دوم

۸۔جنگ نامہ : جنگ نامہ

میر کے تمام شعری سرمایے کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ غزلیں ہوں یا مثنویاں، ان کے یہاں اشیا کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔اشیا کا یہ کثرت بیان جہاں ان کے ڈکشن کی وسعت پر دال ہے، وہیں یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ ان کا مشاہدہ بھی گہرا اور وسیع تھا۔وہ ایسے شاعر ہرگز نہیں تھے جو دنیا سے بیزار اور کنارہ کش ہو کر صرف اپنی ذات میں ہی محو رہتے۔اشیا کے تعلق سے ان کے یہاں بعض الفاظ ایسے ملتے ہیں جن کو میر کے بعد یا میر سے پہلے شاید ہی کسی اور شاعر نے استعمال کیا ہو۔میر کی وحوشیہ، عشقیہ، ہجویہ اور شکار نامہ تو ایسی مثنویاں ہیں کہ اشیا بالخصوص غیر انسانی اشیا کے بیان اور ان کے ساتھ شاعر کے رویے کی بنا پر شمس الرحمٰن فاروقی نے ان مثنویوں کو ''میر کا زندہ عجائب گھر'' قرار دیا ہے۔میر کے کلام کی اسی رنگارنگی کی بنا پر کلام میر کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ چہل پہل اور متحرک زندگی سے بھرپور کلام ہے۔میر نے صرف اشیا کی فہرست سازی نہیں کی بلکہ انھوں نے اس سے کثرت معنی پیدا کرنے کا کام بھی لیا ہے۔مثنویات میر کی فہرست پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے جانوروں اور پرندوں کے بارے میں نہ صرف وحوشیہ، شکارنامے میں لکھا ہے بلکہ ہجویہ اور عاشقانہ مثنویوں میں بھی غیر انسانی اشیا کو مرکزیت حاصل ہے۔ان مثنویوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جانوروں اور ننھی منی اشیا سے میر کو نہایت دلچسپی تھی۔میر کی یہ دلچسپی دراصل انسانی دنیا کے مختلف مظاہر سے ان کے شغف کو ظاہر کرتی ہے۔میر نے جانوروں کو انسانی صفات کا حامل دکھایا ہے۔وہ جانوروں کے وجود کو بھی ایسے ہی ایک وجود تسلیم کرتے ہیں جیسے انسان کا وجود۔

میر کی عشقیہ مثنویوں کا ہیرو اردو کی بعض بڑی اور مشہور مثنویوں کے ہیرو سے یکسر مختلف ہے۔طویل داستانی مثنویوں کا ہیرو عام طور پر کوئی شاہزادہ، نواب زادہ، امیر زادہ ہوتا ہے اور وہ اپنے طبقے کی صفات سے متصف ہوتا ہے۔اس کے ساتھ لاؤ لشکر، فقیروں اور جوگیوں کی دعائیں، پریوں کا تعاون اور دوسرے مافوق الفطرت عناصر بھی ہوتے ہیں۔وہ خود بھی بہادر اور آلات حرب کے استعمال میں ماہر و مشاق ہوتا ہے۔اس کے برعکس میر کا ہیرو ایک عام انسان کی طرح نظر آتا ہے۔اس پر غزل کے عاشق کی چھاپ نمایاں نظر آتی ہے۔اس کے عشق کا زمانہ دشمن ہے اور وہ غزل کے عاشق کی طرح حرماں نصیب ہی رہتا ہے۔مثنوی ''دریائے عشق'' کے ہیرو میں بھی آپ کو یہی اوصاف نظر آئیں گے۔اس مثنوی میں عاشق کا دردناک انجام اس کی موت کی صورت میں سامنے آتا ہے۔دلچسپ پہلو یہ ہے کہ عاشق کی موت کے بعد معشوق کو بھی عشق کا احساس ہوتا ہے اور وہ بھی سدھ بدھ گنوا کر، بے قراری کے عالم میں اسی جگہ ڈوب کر اپنی جان دے دیتا ہے۔جب عاشق و معشوق کی لاش پانی کی سطح پر آتی ہے تو وہ ایک دوسرے میں پیوست نظر آتے ہیں۔دونوں کو الگ کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔یعنی زندگی میں تو وصل نصیب نہیں ہوا البتہ موت کے بعد وصال ضرور ہوا۔اس طرح مثنوی کا اختتام ایک المیہ اور حزنیہ کیفیت پر ہوتا ہے۔

ان کی عشقیہ مثنویوں کا لب ولہجہ یاس اور محرومی سے پر ہوتا ہے۔ یہ مثنویاں بظاہر تو عام انسانی زندگی کے معاملات سے سروکار رکھنے والی معلوم ہوتی ہیں لیکن غور کیا جائے تو عشق کی کیفیت اور ماہیت سراسر ماورائی اور مثالی ہے۔ ان کی عشقیہ مثنویاں عام طور پر عشق کی داستان اور کردار نگاری سے زیادہ ہمہ سوزی، دل سوزی اور جاں سوزی کے وصف کو اجاگر کرتی ہیں۔ گویا ان مثنویوں میں عشقیہ داستان سے زیادہ تصور عشق کی پیش کش پر زور نظر آتا ہے۔ اس بات کا اندازہ عشقیہ مثنویوں کے اس پہلو سے بھی ہوتا ہے کہ میر مثنوی کی ابتدا یا خاتمے میں عشق کی ماہیت اور نوعیت کے حوالے سے اشعار رقم کرتے ہیں۔ مثنوی ''دریائے عشق'' کے ابتدائی اشعار کے ملاحظے سے یہ بات آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ بلکہ مثنوی کے اختتام پر مقولۂ شاعر کے ابتدائی دو اشعار کی بھی یہی نوعیت ہے:

میرؔ اب شاعری کو کر موقوف
عشق ہے ایک فتنۂ معروف

قدرت اپنی جہاں دکھاتا ہے
اس سے جو تو کہے سو آتا ہے

7.3.2 منتخب متن کی تدریس و تفہیم

عزیز طلبا! آیئے اب ہم میر کی شامل نصاب مثنوی ''دریائے عشق'' کے منتخب حصے کی قرأت کرتے ہیں:

(دریائے عشق)

عشق ہے تازہ کار و تازہ خیال — ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال
دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا — کہیں سینے میں آہ سرد ہوا
کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا — کہیں سر میں جنون ہو کے رہا
کہیں رونا ہوا ندامت کا — کہیں ہنسنا ہوا جراحت کا
گہ نمک اس کو داغ کا پایا — گہ پتنگا چراغ کا پایا
واں طپیدن ہوا جگر کے بیچ — یاں تبسم ہے زخم تر کے بیچ
کہیں آنسو کی یہ سرایت ہے — کہیں یہ خوں چکاں حکایت ہے
تھا کسی دل میں نالۂ جاں کاہ — ہے کسو لب پہ ناتواں اک آہ
تھا کسو کی پلک کی نم ناکی — ہے کسو خاطروں کی غم ناکی
کہیں باعث ہے دل کی تنگی کا — کہیں موجب شکستہ رنگی کا
کہیں اندوہ جان آگہ تھا — سوزش سینہ ایک جاگہ تھا

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

کہیں عشاق کی نیاز ہوا   کہیں اندوہ جاں گداز ہوا
ہے کہیں دل جگر کی بے تابی   تھا کسو مضطرب کی بے خوابی
کسو چہرے کا رنگ زرد ہوا   کسو محمل کی رہ کی گرد ہوا
طور پر جا کے شعلہ پیشہ رہا   بے ستوں میں شرار تیشہ رہا
کہیں نے بست کو لگائی آگ   کہیں تیغ و گلو میں رکھی لاگ
کبھو افغان مرغ گلشن تھا   کبھو قمری کا طوق گردن تھا
کسو مسلخ میں جا قنارہ ہوا   کوئی دل ہو کے پارہ پارہ ہوا
ایک عالم میں دردمندی کی   ایک محفل میں جا سپندی کی
ایک دل سے اٹھے ہے ہو کر دود   ایک لب پر سخن ہے خون آلود
اک زمانے میں دل کی خواہش تھا   اک سمیں میں جگر کی کاہش تھا
کہیں بیٹھے ہے جی میں ہو کر چاہ   کہیں رہتا ہے قتل تک ہمراہ
خار خار دل غریباں ہے   انتظار بلا نصیباں ہے
کہیں شیون ہے اہل ماتم کا   کہیں نوحہ ہے جان پر غم کا
آرزو تھا امیدواروں کی   درد مندی جگر فگاروں کی
نمک زخم سینہ ریشاں ہے   نگہ یاس مہر کیشاں ہے
حسرت آلود آہ تھا یہ کہیں   شوق کی ایک نگاہ تھا یہ کہیں
کشش اس کی ہے ایک اعجوبہ   ڈوبا عاشق تو یار بھی ڈوبا
کوئی محروم وصل یاں سے گیا   کہ نہ یار اس کا پھر جہاں سے گیا
کام میں اپنے عشق پکا ہے   ہاں یہ نیرنگ ساز یکہ ہے
جس کو ہو اس کی التفات نصیب   ہے وہ مہمان چند روزہ غریب
ایسی تقریب ڈھونڈھ لاتا ہے   کہ وہ ناچار جی سے جاتا ہے

آغاز قصۂ جاں گداز

ایک جا اک جوان رعنا تھا   لالہ رخسار و سرو بالا تھا
عشق رکھتا تھا اس کی چھاتی گرم   دل وہ رکھتا تھا موم سے بھی نرم
شوق تھا اس کو صورت خوش سے   انس رکھتا تھا وضع دل کش سے
تھا طرح دار آپ بھی لیکن   رہ نہ سکتا تھا اچھی صورت بن

کوئی ترکیب اگر نظر آتی
صورت حال اور ہو جاتی

دیکھتا گر وہ کوئی خوش پرکار
رہتا خمیازہ کش ہی لیل و نہار

زلف ہوتی کسو کی گر برہم
دیکھتے اس کے حال کو درہم

دیکھتا گر کہیں وہ چشم سیاہ
دل سے بے اختیار کرتا آہ

سر میں تھا شور شوق دل میں تھا
عشق ہی اس کے آب وگل میں تھا

الغرض وہ جوان خوش اسلوب
ناشکیبا رہے تھا بے محبوب

ایک دن بے کلی سے گھبرایا
سیر کرنے کو باغ میں آیا

کسو گل پاس وہ صنم ٹھہرا
کہیں سبزے میں ایک دم ٹھہرا

اک خیاباں میں سے ہو نکلا
ایک سائے تلے سے رو نکلا

نہ تسلی ہوا دل بے تاب
نہ تھما چشم تر سے خون ناب

دل کی واشد سے بے توقع ہو
ہر شجر کے تلے بہت سا رو

دیکھ گلشن کو نا امیدانہ
منھ کیا ان نے جانب خانہ

دل کے رکنے کا اس کو اک غم تھا
راہ چلنے میں خیال درہم تھا

ناگہ اس کوچہ سے گذار ہوا
آفت تازہ سے دو چار ہوا

ایک غرفے سے ایک مہ پارہ
تھی طرف اس کے گرم نظارہ

پڑ گئی اس پہ اک نظر اس کی
پھر نہ آئی اسے خبر اس کی

تھی نظر یا کہ جی کی آفت تھی
وہ نظر ہی وداع طاقت تھی

ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ
صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ

بے قراری نے کج ادائی کی
تاب و طاقت نے بے وفائی کی

منھ جو اس کا طرف سے اس کے پھرا
مضطرب ہو کے خاک پر یہ گرا

وہ تو رکھتی نہ تھی خیال اس کا
بے طرح ہووے گو کہ حال اس کا

جھاڑ دامن کے تئیں وہ مہ پارہ
اٹھ گئی سامنے سے یک بارہ

وہ گئی اس کے سر بلا آئی
خاک میں مل گئی وہ رعنائی

دل پہ کرنے لگا طپیدن ناز
رنگ چہرے سے کر چلا پرواز

ہاتھ جانے لگا گریباں تک
چاک کے پھیلے پاؤں داماں تک

طبع نے اک جنوں کیا پیدا
اشک نے رنگ خوں کیا پیدا

سوزش دل نے جی میں جا گہ کی
داغ نے آ جگر کو آتش دی

بستر خاک پر گرا وہ زار
درد کا گھر ہوا دل بیمار

خاطر افگار خار خار ہوئی
جاں تمناکش نگار ہوئی

اس کے منھ پر پڑی جو اس کی نگاہ
ناامیدی کے ساتھ ہی سر کی آہ

خو ہوئی نالۂ حزیں کے ساتھ
رابطہ آہ آتشیں کے ساتھ

ہونٹھ سوکھے تو خون ناب ملا
خواب و خور دونوں کو جواب ملا

خلق اس کی ہوئی تماشائی
پر نہ وہ دیکھنے کبھو آئی

کچھ کہا گر کسو نے شفقت سے
رو دیا ان نے ایک حسرت سے

جا کے اس کے قریب در بیٹھا
قصد مرنے کا اپنے کر بیٹھا

دل نہ سمجھا کہ اضطراب کیا
شوق نے کام کو خراب کیا

جو کہ سمجھے تھے اس کو دیوانہ
رحم کرتے تھے آشنایانہ

عاشق اس کو کسو کا جان گئے
سب برا اس ادا کو مان گئے

کیونکہ باہم معاش تھی سب کی
ایک جا بود و باش تھی سب کی

وارث اس کے بھی بدگمان ہوئے
درپئے دشمنی جان ہوئے

مشورت تھی کہ مار ہی ڈالیں
دفعتہً اس بلا کے تیں ٹالیں

پھر یہ ٹھہری کہ ہوں گے ہم بدنام
سن کے آخر کہیں گے خاص و عام

کیا گنہ تھا کہ یہ جواں مارا
کن نے مارا اسے کہاں مارا

ہووے یہ خون خفتہ گر بیدار
کھینچنی ہووے خفتِ بسیار

کیجیے ایک ڈھب سے اس کو تنگ
تا نہ عائد ہو اپنی جانب ننگ

تہمت خبط رکھیے اس کے سر
کیجیے سنگ سار اس کو پھر

دے کے دیوانہ اس جواں کو قرار
ہوگئے سارے درپئے آزار

ایک نے سخت کہہ کے تنگ کیا
ایک نے آ کے زیر سنگ کیا

ایک آیا تو ہاتھ میں شمشیر
ایک بولا کہ اب ہے کیا تاخیر

کی اشارت کہ کودکان شہر
آئے لبریز غصہ و پُر قہر

گرچہ ہنگامہ اس کے سر پر تھا
لیک روے دل اس کا اودھر تھا

محو تھا اس کے یہ خیال کے بیچ
تھا گرفتار اپنے حال کے بیچ

ہونٹھ پر حسن کا بیاں اس کا
تھا سر و سنگ آستاں اس کا

ایک دم آہ سرد بھر اٹھنا
نالۂ گرم گاہ کر اٹھنا

جی میں کہتا کہ آہ مشکل ہے
اس طرف یک نگاہ مشکل ہے

دوست کو میرے نام سے ہے ننگ
دشمنوں سے ہے جی پہ عرصہ تنگ

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

چشم تر سے لہو بہا کرتا
صبح کی باد سے کہا کرتا

کاے نسیم سحر یہ اس سے کہہ
مست تغافل کر اور غافل رہ

ان بلاؤں میں کوئی کیونکے جیے
جان پر آ بنی ہے تیرے لیے

جان دوں تیرے واسطے سو تو
آنکھ اٹھا کر ادھر نہ دیکھے کبھو

رفتہ رفتہ ہوا ہوں سودائی
دور پہنچی ہے میرے رسوائی

نام کو بھی ترے نہ جانا آہ
تجھ سے کیونکر سخن کی نکلے راہ

ناامیدانہ گر کروں ہوں نگاہ
دیکھتا ہوں ہزار روز سیاہ

سخت مشکل ہے سخت ہے بیداد
ایک میں خوں گرفتہ سو جلاد

کوئی مشفق نہیں کہ ہووے شفیق
بیکسی بن نہیں ہے کوئی رفیق

نالہ ہوتا ہے گر کبھی دلجو
گریہ آنکھوں سے پونچھتا ہے رو

آہ جو ہمدمی سی کرتی ہے
اب تو وہ بھی کمی سی کرتی ہے

چشم رکھتا ہے وصل کی یہ دل
جی ہے اس سے اسیر آب و گل

ورنہ ترکیب یہ کہاں ہوتی
صورت اک معنی نہاں ہوتی

اب ٹھہرتا نہیں ہے پائے ثبات
ایک میں اور کتنے تصدیعات

سنگ باراں سے سخت ہوں دل تنگ
شیشۂ دل نہیں ہے پارۂ سنگ

محرم یک نگاہ بیش نہیں
کم ہے سینے میں جا کہ ریش نہیں

کیونکے کہیے کہ تو نہیں آگاہ
اک قیامت بپا ہے یاں سر راہ

کچھ چھپا تو نہیں رہا یہ راز
اک جہاں اس سے ہے خبر پرداز

پس تغافل ہوا ترحم کر
گوش دل جانب تظلم کر

کون کہتا ہے رہ نہ محو ناز
پر نہ اتنا کہ جی سے جائے نیاز

جب ہوا ذکر اقل و اکثر میں
چاہ ثابت ہوئی اسے گھر میں

شب محافے میں اس کو کر کے سوار
ساتھ دے ایک دایۂ غدار

پار دریا کے جلد رخصت کی
اس طرح فکر رفع تہمت کی

گھر سے باہر محافہ جو نکلا
اس جواں ہی کے پاس ہو نکلا

طپش دل سے ہو کے یہ آگاہ
ہو لیا ساتھ اس کے بھر کر آہ

قطرہ زن اشک سا وہ راہ تمام
درپئے یار تھا وہ بے آرام

ہر قدم تھا زبان پر جاری
خواب ہے یا کہ ہے یہ بیداری

ہمسری اس کی تھی میسر کب
ہے مجھے بخت واژگوں سے عجب

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

شوق مفرط نے بے تہی کی سخت
نوشکیبی نے دل سے باندھا رخت

رفتہ رفتہ سخن ہوئے نالے
اڑنے لاگے جگر کے پرکالے

اضطراب دلی نے زور کیا
ان نے بے اختیار شور کیا

دل کے غم کو زبان پر لایا
آفت تازہ جان پر لایا

کاے جفا پیشہ و تغافل کیش
اک نظر سے زیاں نہیں کچھ بیش

منھ چھپایا ہے تو نے اس پر بھی
نگہ التفات ادھر بھی

صبر کس کس بلا سے کر گزروں
چارہ اس بن نہیں کہ مر گزروں

منزل وصل دور میں کم پا
تجھ کو اس مرتبے میں استغنا

ہے تو نزدیک دل سے اے طناز
لیک تجھ تک سفر ہے دور دراز

ناز نے یک نفس نہ رخصت دی
آئینے نے تجھے نہ فرصت دی

تو تو واں زلف کو بنایا کی
جان یاں پیچ و تاب کھایا کی

تجھ کو تھی اپنے خال رخ پہ نگاہ
دل مرا مبتلائے داغ سیاہ

تجھ کو مدنظر تھی اپنی چال
میں ستم کش ہوا کیا پامال

بستر خواب پر تجھے آرام
مجھ کو خمیازہ کھینچنے سے کام

واں لب لعل تیرے خنداں تھے
یاں فشردہ جگر پہ دنداں تھے

ناز و خوبی نے دل دیا نہ تجھے
رحم سے آشنا کیا نہ تجھے

اب تغافل نہ کر تلطف کر
حال پر میرے ٹک تاسف کر

آب کیسا کہ بحر تھا ذخار
تند و مواج و تیرہ و تہ دار

موج کا ہر کنایہ طوفاں پر
مارے چشمک حباب عماں پر

ہم کنار بلا ہر اک گرداب
لجہ سرمایہ بخش تیرہ سحاب

گزر موج جب نہ تب دیکھا
ساحل اس کا نہ خشک لب دیکھا

کشتی اک آن کر ہوئی موجود
ہو فلک سے ہلال جیسے نمود

کی کنارے پہ لا کے استادہ
تھا محافہ رکوب آمادہ

اس سفینے میں جلد جا پہنچا
یہ بھی واں ساتھ ہی لگا پہنچا

بیچ دریا میں دایہ نے جا کر
کفش اس گل کی اس کو دکھلا کر

پھینکی پانی کی سطح پر اک بار
اور بولی کہ او جگر افگار

حیف تیرے نگار کی پاپوش
موج دریا سے ہووے ہم آغوش

غیرت عشق ہے تو لا اس کو
چھوڑ مت یوں برہنہ پا اس کو

سن کے یہ حرف دایۂ مکار	دل سے اس کے گیا شکیب و قرار
بے خبر کار عشق کی تہ سے	جست کی ان نے اپنی جا گہ سے
تھا سفینے میں یا کہ دریا میں	موج زنجیر ہوگئی پا میں
کھنچ گیا قعر کو یہ گوہر ناب	تھی کشش عشق کی مگر تہ آب
کہتے ہیں ڈوبتے اچھلتے ہیں	لیکن ایسے کوئی نکلتے ہیں
ڈوبے جو یوں کہیں وہ جا نکلے	غرق دریائے عشق کیا نکلے
عشق نے آہ کھو دیا اس کو	آخر آخر ڈبو دیا اس کو
جب کہ دریا میں ڈوب کر وہ جواں	کھو گیا گوہر گرامی جاں
دایۂ حیلہ گر ہوئی دل شاد	واں سے کشتی چلی بہ رنگ باد
یہ نہ سمجھی کہ عشق آفت ہے	فتنہ سازی میں اک قیامت ہے
خاک ہو کیوں نہ عاشق بے دل	کام سے اپنے یہ نہیں غافل
وصل جیتے نہ ہو میسر اگر	لاوے معشوق کو یہ تربت پر
یاں سے عاشق اگر گئے ناشاد	خاک خوباں بھی ان نے دی برباد
قصہ کوتاہ بعد یک ہفتہ	آئی وہ رشک مہ ز خود رفتہ
کہنے لاگی کہ اب تو اے دایہ	ہوگیا غرق وہ فرومایہ
اب تو وہ ننگ درمیاں سے گیا	آرزو مند اس جہاں سے گیا
تھے جو ہنگامے اس کے حد سے زیاد	ساتھ اس کے گئے وہ شور و فساد
شور فتنے تھے اس تلک سارے	اب تو بدنامیاں نہیں بارے
دل تڑپتا ہے متصل میرا	مرغ بسمل ہے یا کہ دل میرا
وحشت طبع اب تو افزوں ہے	حال جی کا مرے دگرگوں ہے
بے دماغی کمال ہوتی ہے	جان تن کے وبال ہوتی ہے
دل کوئی دم میں خون ہووے گا	آج کل میں جنون ہووے گا
بے کلی جی کو تاب دیتی ہے	طاقت دل جواب دیتی ہے
جی میں آتا ہے ہوں بیابانی	پر کہوں ہوں کہ ہے یہ نادانی
مصلحت ہے کہ مجھ کو لے چل گھر	ایک دو دم رہیں گے دریا پر
گاہ باشد کہ دل مرا وا ہو	ورنہ کیا جانیے کہ پھر کیا ہو
یہ نہ سوچی کہ بد بلا ہے عشق	گھات میں اپنی لگ رہا ہے عشق
جس کسو سے یہ پیار رکھتا ہے	عاقبت اس کو مار رکھتا ہے

جذب سے اپنے جب کرے ہے کام — عاشق مردہ سے بھی لے ہے کام
صبح گاہاں وہ غیرت خورشید — اس جگہ سے رواں ہوئی نومید
پہنچی نصف النہار دریا پر — روئی بے اختیار دریا پر
حد سے افزوں جو بے قرار ہوئی — دایہ کشتی میں لے سوار ہوئی
حرف زن یوں ہوئی کہ اے دایہ — یاں گرا تھا کہاں وہ کم مایہ
مکر میں گرچہ دایہ تھی کامل — لیک تہ سے سخن کے تھی غافل
یہ نہ سمجھی کہ ہے فریب عشق — ہے یہ مہ پارہ ناشکیب عشق
بیچ دریا کے جا کہا یہ حرف — یاں ہوا تھا وہ ماجرائے شگرف
سنتے ہی یہ کہاں کہاں کر کر — گر پڑی قصد ترک جاں کر کر
موج ہر اک کمند شوق تھی آہ — لپٹی اس کو بہ رنگ مار سیاہ
حسن موجوں میں یوں نظر آوے — نور مہتاب جیسے لہراوے
تھیں وہ اس کی حنائی انگشتاں — غیرت افزائے پنجۂ مرجاں
سر پہ جس دم کہ آب ہو کے بہا — سطح پانی کا آئینہ سا رہا
کشش عشق آخر اس مہ کو — لے گئی کھینچتی ہوئی تہ کو
کودے غواص و آشنا سارے — تا بہ مقدور دست و پا مارے
کھینچ کر کوفت سب ہوئے بیتاب — نہ لگا ہاتھ وہ در نایاب
جا ہم آغوش مردہ یار ہوئی — تہ میں دریا کے ہم کنار ہوئی
پاک کی زندگی کی آلائش — ہو کے دست و بغل کی آسائش
نکلے باہم ولے موئے نکلے — دونوں دست و بغل ہوئے نکلے
ربط چسپاں بہم ہویدا تھا — مر گئے پر بھی شوق پیدا تھا
ایک کا ہاتھ ایک کی بالیں — ایک کے لب سے ایک کو تسکیں
جو نظر ان کو آن کرتے تھے — ایک قالب گمان کرتے تھے
کیا لکھوں مل رہے وہ وصلی وار — ہم دگر سے جدا ہوئے دشوار
کیوں نہ دشوار ہووے ان کا فصل — جان دے دے ہوا ہو جن کا وصل
حیرت کار عشق سے مردم — شکل تصویر آپ میں تھے گم

مقولۂ شاعر

میرؔ اب شاعری کو کر موقوف — عشق ہے ایک فتنۂ معروف
قدرت اپنی جہاں دکھاتا ہے — اس سے جو تو کہے سو آتا ہے

کتنی طاقت تری زباں میں ہے　　　　کتنی وسعت ترے بیاں میں ہے

یاں سخن کی فرامشی بہتر　۲۰۵　لب پہ اب مہر خامشی بہتر

تشریح:

ابتداً بتیس اشعار میں میر نے عشق کی نوعیت و ماہیت، کرشمہ سازی اور نیرنگیوں کا بیان کیا ہے۔ ہر مصرعے میں عشق سے پیدا ہونے والے ایک نئے انجام اور عشق کی ایک مختلف صورت اور حالت کا ذکر کیا ہے۔ بات سے بات پیدا کرتے ہوئے تمہید کے آخری دو اشعار میں قصے کے لیے راہ بھی ہموار کی ہے۔ یہ تمہید نہ صرف عشق کی مختلف کیفیات اور اس کے نتیجے میں پیدا شدہ اثرات کو بیان کرتی ہے بلکہ سامع یا قاری کو قصے کی نوعیت کے اعتبار سے جذباتی اور ذہنی سطح پر مائل بھی کرتی ہے۔ اس تمہید کی وجہ سے قاری یا سامع ذہنی اور جذباتی سطح پر قصے کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور بیان واقعہ کی اثر پذیری فزوں تر ہو جاتی ہے۔

شاعر نے ابتدا ہی میں عشق کو تازہ کار و تازہ خیال کہہ کر ہر آن ایک نئی چال چلنے والا قرار دیا ہے۔ یہاں چال کے معنی میں بڑا لطف ہے۔ چال کے معنی طور اور انداز کے تو ہیں ہی ساتھ ہی فریب اور دھوکا کے معنی بھی کارآمد ہیں۔ گویا اس نے آغاز بیان میں ہی عشق کے تعلق سے اپنے مشاہدے، تجربے اور نقطۂ نظر کی وضاحت کر دی ہے۔ تقریباً ہر شعر کے ہر مصرعے میں عشق کا ایک نیا روپ اور اس کے اثرات کو متضاد کیفیت اور وصف کا حامل بتایا ہے۔ مثال کے طور پر ندامت کا رونا عشق کو دردمند اور جراحت کا ہنسنا اس کی شقاوت کا اظہار ہے۔ اسی طرح داغ کا نمک ہونا اس کی اذیت رسانی کی صفت ہے تو چراغ کا پتنگا ہونا ایثار و قربانی جیسی اعلیٰ صفت۔ بیشتر اشعار کے ایک مصرعے کا بیان معشوق کی صفت یا اس کی بے التفاتی اور سرد مہری سے پیدا شدہ حالات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور دوسرا مصرعہ عاشق اور اس کی وفا شعاری اور جاں نثاری کی طرف۔

شعر نمبر ۳۳ سے اصل قصے کا آغاز ہوتا ہے۔ شعر نمبر ۴۹ تک قصے کے ہیرو کا مزاج اور اس کی افتاد طبع کا بیان ہے۔ ہیرو ایک جوان رعنا ہے جس کے سینے میں عشق کا شعلہ جل رہا ہے اور حسین ہونے کی وجہ سے حسن کا قدردان بھی ہے۔ عشق کی آگ اس کے سینے میں جلتی تھی لیکن کوئی معشوق نہیں تھا۔ شعلۂ عشق نے اسے بے کل کر رکھا تھا اس لیے وہ تلاش حسن میں ادھر ادھر بھٹکتا رہتا تھا۔ اسی عالم میں ایک دن وہ سیر باغ کو گیا لیکن وہاں بھی اس کا دل نہیں لگا۔ ناامیدی کے ساتھ اس نے گھر واپسی کا رخ کیا۔ پچاسویں شعر میں صورت حال تبدیل ہوتی ہے۔ ایک کوچے سے اس کا گزر ہوتا ہے اور ایک جھروکے میں اسے ایک مہ پارہ نظر آتی ہے۔ یہ جوان رعنا اسے دیکھ کر اپنی سدھ بدھ کھو دیتا ہے۔ اس کے سینے میں عشق کا جو شعلہ سلگ رہا تھا وہ بھڑک اٹھتا ہے۔ اس کی اس کیفیت سے معشوق انجان ہے لیکن جوان کی بے قراری بڑھتی جاتی ہے۔ وہ ایک تماشا بن گیا لیکن معشوق اسے دیکھنے کبھی نہیں آیا۔ آخر اس نے معشوق کے در پر جم کر بیٹھنے کا فیصلہ کر لیا۔ شعر نمبر اکہتر سے پھر صورت واقعہ

میں بدلاؤ آتا ہے۔اب سبھی لوگ جان گئے کہ یہ کسی کا عاشق ہے۔اس کے عشق کا شہرہ ہوا۔معشوق کے اعزہ و اقارب بھی صورت حال سے آگاہ ہوئے اور عاشق صادق کی جان کے دشمن ہوگئے۔لیکن وہ قتل عاشق سے بدنام نہیں ہونا چاہتے تھے اس لیے اسے خبط الحواس مشہور کردیا اور محلے کے لڑکے بالے اس کے پیچھے لگادیے۔ ان سب باتوں سے بے خبر اور بے پرواہ عاشق بس معشوق کے خیال میں محو ہے۔معشوق کی بے نیازی نے اسے اپنے آپ سے باتیں کرنے پر مجبور کردیا ہے۔کبھی وہ ہواؤں سے اپنا حال دل کہتا ہے اور یہ امید رکھتا ہے کہ نسیم سحر اس کا پیغام معشوق تک پہنچائے گی۔ یہ سارا بیان نہایت دلدوزی اور شورانگیزی کے ساتھ رقم کیا گیا ہے۔شعر نمبر ۱۱۲ تک اسی بے قراری اور اضطراب کا بیان ہے۔ادھر جب اس کے عشق کی شہرت حد درجہ بڑھ گئی تو معشوق کے اہل خانہ نے رسوائی سے بچنے کے لیے معشوق کو چند روز کے لیے کہیں اور بھیجنے کا فیصلہ کرلیا۔ایک رات معشوق اور اس کی دائی گھر سے باہر نکلے تو سواری عاشق کے پاس ہی سے گزری۔عاشق بھی ساتھ ہولیا اور اس نے اپنے دل کا سارا ماجرا کہہ سنایا۔دائی بہت چالاک اور مکار تھی۔اس نے عاشق کو تسلی دی اور اپنے ساتھ لے چلی۔آگے سفر دریا کا تھا۔یہ سبھی کشتی میں سوار ہوگئے۔اب دایہ نے چال چلی اور معشوق کی جوتی پانی میں پھینک کر اس جوان کو غیرت دلائی۔جوان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جوتی نکالنے کے لیے دریا میں کود پڑا غرق آب ہوگیا۔اس سارے بیان میں بھی میر نے بڑی دل سوزی اور دردمندی کی کیفیت پیدا کی ہے۔

شعر نمبر ۱۶۲ سے کہانی میں ایک نیا موڑ آتا ہے۔جوان رعنا کے ڈوبنے کے بعد جب معشوق اور دایہ اپنی منزل پر پہنچتے ہیں تو ایک ہفتے بعد معشوق کے دل میں شعلۂ شوق نے جگہ بنائی۔شاید یہ اس کی پشیمانی تھی۔الغرض وہ دایہ سے بضد ہوئی کہ اس جگہ پر جانے کے لیے جہاں وہ عاشق صادق ڈوبا تھا۔یہ عشق کی ایک ایسی نئی چال تھی جس کو دایہ جیسی جہاں دیدہ اور مکر والی عورت سمجھ نہ سکی۔جب یہ دریا میں اس مقام پر پہنچے جہاں عاشق ڈوبا تھا، معشوق نے بھی بے اختیار چھلانگ لگادی اور غرق دریا ہوگیا۔معشوق کی تلاش میں غوطہ خوروں نے کوشش شروع کی اور کامیاب ہوئے۔ جب سطح آب پر دونوں کی لاشیں لائی گئیں تو اس صورت کہ دونوں ایک دوسرے سے چسپاں۔دونوں کو جدا کرنا دشوار تھا۔وصل بعد الموت کی اس کیفیت کو میر نے ''حیرت کار عشق'' قرار دیا۔مثنوی میں قصے کا صرف دردانگیز بیان نہیں ہے بلکہ شاید ہی کوئی شعر ایسا ہو جس میں میر نے رعایتوں اور مناسبتوں کا التزام نہ کیا ہو۔لفظی انسلاکات سے فائدہ نہ اٹھایا ہو۔میر کی یہ مثنوی سادہ اور پرکاری کی بہترین مثال ہے۔اس میں آپ بہت سے ایسے الفاظ دیکھیں گے جو اردو میں کم کم ہی استعمال ہوئے ہیں۔اس اندازہ ہوتا ہے کہ میر کس قدر تلاش لفظ تازہ کے متلاشی تھے۔

7.3.3 ماحصل

آپ نے مثنوی کے فن کا مطالعہ کرتے وقت مثنوی کے اجزائے ترکیبی کے بارے میں پڑھا ہوگا۔ عام طور پر مثنوی کے حسب ذیل اجزائے ترکیبی کا ذکر کیا جاتا ہے: حمد و مناجات، نعت، منقبت، حاکم وقت کی مدح، اپنی قادرالکلامی پر فخر و مباہات، سبب تالیف مثنوی، واقعہ نگاری، منظر نگاری، قصہ در قصہ، مافوق الفطری عناصر اور خاتمہ وغیرہ۔

خیال رہے کہ مثنوی کے مندرجہ بالا اجزا تمام مثنویوں میں پائے جائیں، یہ ضروری نہیں۔ بلکہ یہ اجزا بعض شاہکار اور قدیم مثنویوں کے متن سے اخذ کیے گئے ہیں۔ بالخصوص سحرالبیان اور گلزار نسیم جیسی یکتائے زمانہ مثنویوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مثنوی کے اجزائے ترکیبی کی تدوین کی گئی ہے۔ لہٰذا ان مثنویوں یا ان جیسی دیگر مثنویوں کا مطالعہ ان اجزا کی روشنی میں کیا جاسکتا ہے۔ لیکن مثنوی کی روایت کو دیکھتے ہوئے یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ بیشتر مثنویاں ان اجزا سے عاری ہیں۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ مذکورہ اجزائے ترکیبی مخصوص مثنوی کے اضافی اوصاف میں سے ہیں جن سے مثنوی کا حسن اور اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ جب ہم ''اجزائے ترکیبی'' کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ بیشتر اجزا یا بعض اجزا کا وجود کسی شعری متن میں نہایت ضروری ہے۔ جو متن ان اجزا سے عاری ہوگا اسے متعلقہ صنف سے دیگر کچھ اور سمجھا جائے گا۔ مثنوی کے تعلق سے سب سے اہم بات یہ ہے کہ مثنوی ایک بیانیہ صنف ہے جس کے اشعار مسلسل ہوتے ہیں اور ہر شعر کا قافیہ جدا ہوتا ہے۔ تسلسل بیان اس کا اہم وصف ہے۔ اس میں اشعار کی تعداد بھی متعین نہیں ہوتی، موضوع بھی مخصوص نہیں ہوتے۔ ہر موضوع پر مثنوی کہی جاسکتی اس لیے اس کے موضوعات کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ اس روشنی میں آپ میر کی منتخبہ مثنوی یا دیگر مثنویوں کا مطالعہ کریں تو آپ پر روشن ہوگا کہ عشقیہ مثنویوں کے سوا میر کی مثنویوں میں بیان واقعہ پر زیادہ زور ہے۔ عشقیہ مثنویوں میں بیان واقعہ سے زیادہ عشق کی ماہیت اور نوعیت کے بیان پر اصرار ہے۔ مثنویات میر میں تسلسل بیان کا وصف توجہ طلب ہے۔ مثنویات میر میں بیان و بدیع اور رعایت لفظی نیز لفظی مناسبات کا خاص التزام پایا جاتا ہے۔ میر کو غیر انسانی اشیا اور مظاہر سے حد درجہ دلچسپی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اپنے اطراف و جوانب کا گہرا مشاہدہ تھا، اور وہ اپنے اطراف سے بھی کس قدر شغل رکھتے تھے۔ ان کی مثنویوں میں غیر انسانی اشیا اور مظاہر کا بیان اس انداز سے ہوا ہے کہ وہ انسانی صفت سے متصف نظر آتی ہیں۔ ان کی عشقیہ مثنویوں میں کردار نگاری، بزم آرائی، منظر نگاری اور نشاط انگیز مکالموں سے زیادہ دل سوزی اور حرماں نصیبی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔

7.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- میرؔ کی مثنویوں کے فکر وفن سے واقفیت حاصل کی۔
- میرؔ کی مثنویوں کے موضوعات ومضامین اور امتیازات جانا۔
- مثنوی نگاری کے میدان میں میرؔ کی عظمت کو پہچانا۔
- شامل نصاب مثنوی کے متن کی قرأت کی۔
- شامل نصاب متن کی تشریح وتوضیح سمجھی۔

7.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ میرؔ کی ہجویہ اور وحوشیہ زمروں کے تحت لکھی جانے والی مثنویوں کے نام درج کیجیے۔

۲۔ میرؔ کی عاشقانہ اور بہاریہ مثنویوں کے نام تحریر کیجیے۔

۳۔ ''میرؔ کا زندہ عجائب گھر'' سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ واضح کیجیے۔

۴۔ میرؔ کی عشقیہ مثنویوں کی انفرادیت واضح کیجیے۔

۵۔ مثنوی ''دریائے عشق'' کے ابتدائی اشعار کا خلاصہ بیان کیجیے۔

7.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ میرؔ کی ہجویہ اور وحوشیہ مثنویوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

ہجویہ: تسنگ نامہ، در مذمت برشگال، در ہجو نا اہل، در ہجو شخصے، در مذمت آئینہ دار، در ہجو اکول، در ہجو عاقل نام، در ہجو خانۂ خود (خودنوشت سوانح)، در ہجو خانۂ خود کہ بہ سبب شدت باراں خراب شدہ بود

وحوشیہ: در بیان مرغ بازاں، کپی کا بچہ، موہنی بلی، در تعریف سگ وگربہ، در بیان بز، مرثیۂ خروس، اژدر نامہ

۲۔ میرؔ کی عاشقانہ اور بہاریہ مثنویوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

عاشقانہ: شعلۂ عشق، دریائے عشق، معاملات عشق، جوش عشق، اعجاز عشق، خواب وخیال، درحال عشق، درحال افغاں پسر، مورنامہ، درحال مسافر جواں

بہاریہ: در بیان کتخدائی نواب آصف الدولہ بہادر، درجشن ہولی وکتخدائی، در بیان ہولی، درتہنیت کد خدائی بشن سنگھ، ساقی نامہ

۳۔ اشیا کے تعلق سے میر کے یہاں بعض الفاظ ایسے ملتے ہیں جن کو میر کے بعد یا میر سے پہلے شاید ہی کسی اور شاعر نے استعمال کیا ہو۔ وحوشیہ، عشقیہ، ہجویہ اور شکارنامہ میں غیر انسانی اشیا کے بیان کی کثرت ہے جن سے میر نے معنی کی کثرت پیدا کرنے کا کام لیا ہے۔ جانوروں اور ننھی منی اشیا میں میر کی دلچسپی، انسانی دنیا کے مختلف مظاہر سے ان کے شغف کو ظاہر کرتی ہے۔ میر جانوروں کے وجود کو انسانی وجود کی طرح تسلیم کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اپنی مثنویوں میں انھوں نے جانوروں کو انسانی صفات کا حامل بتایا ہے۔ اشیا اور مظاہر بالخصوص

غیر انسانی اشیا کے بیان کی فراوانی کے سبب میر کا کلام چہل پہل اور متحرک زندگی سے معمور ہے۔ کلام میر کی انھیں صفات کی بنا پر شمس الرحمٰن فاروقی نے میر کی مثنویوں کو ''میر کا زندہ عجائب گھر'' قرار دیا ہے۔

۴۔ میر کی عشقیہ مثنویوں کا لب و لہجہ یاس اور محرومی سے پر ہوتا ہے۔ یہ مثنویاں بظاہر تو عام انسانی زندگی کے معاملات سے سروکار رکھتی ہیں لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں عشق کی کیفیت اور ماہیت سراسر ماورائی اور مثالی ہے۔ ان کی عشقیہ مثنویاں عام طور پر عشق کی داستان اور کردار نگاری سے زیادہ ہمہ سوزی، دل سوزی اور جاں سوزی کے وصف کو اجاگر کرتی ہیں۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی مثنویوں میں عشقیہ داستان سے زیادہ تصور عشق کی پیش کش پر زیادہ توجہ ہے۔ اس بات کا اندازہ عشقیہ مثنویوں کے اس پہلو سے بھی ہوتا ہے کہ میر مثنوی کی ابتدا یا خاتمے میں عشق کی ماہیت اور نوعیت کے حوالے سے اشعار رقم کرتے ہیں۔

۵۔ ابتداً بتیس اشعار میں میر نے عشق کی نوعیت و ماہیت، کرشمہ سازی اور نیرنگیوں کا بیان کیا ہے۔ ہر مصرعے میں عشق سے پیدا ہونے والے ایک نئے انجام اور عشق کی ایک مختلف صورت اور حالت کا ذکر کیا ہے۔ بات سے بات پیدا کرتے ہوئے تمہید کے آخری دو اشعار میں قصے کے لیے راہ بھی ہموار کی ہے۔ یہ تمہید نہ صرف عشق کی مختلف کیفیات اور اس کے نتیجے میں پیدا شدہ اثرات کو بیان کرتی ہے بلکہ سامع یا قاری کو قصے کی نوعیت کے اعتبار سے جذباتی اور ذہنی سطح پر مائل بھی کرتی ہے۔ شاعر نے ابتدا ہی میں عشق کو تازہ کار و تازہ خیال کہہ کر ہر آن ایک نئی چال چلنے والا قرار دیا ہے۔ یہاں چال کے معنی میں بڑا لطف ہے۔ چال کے معنی طور اور انداز کے تو ہیں ہی ساتھ ہی فریب اور دھوکا کے معنی بھی کارآمد ہیں۔ گویا اس نے آغاز بیان میں ہی عشق کے تعلق سے اپنے مشاہدے، تجربے اور نقطۂ نظر کی وضاحت کر دی ہے۔ تقریباً ہر شعر کے ہر مصرعے میں عشق کا ایک نیا روپ اور اس کے اثرات کو متضاد کیفیت اور وصف کا حامل بتایا ہے۔ بیشتر اشعار کے ایک مصرعے کا بیان معشوق کی صفت یا اس کے بے التفاتی اور سرد مہری سے پیدا شدہ حالات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور دوسرا مصرع عاشق اور اس کی وفا شعاری اور جاں نثاری کی طرف۔

7.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
طپیدن	:	تڑپ، گرمی، جوش
مسلخ	:	جانوروں کو ذبح کر کے صاف کرنے کا مقام
قنارہ	:	گوشت لٹکانے کا آنکڑا
سپندی	:	ایک کالا دانہ جس سے نظر بد دور کرتے ہیں

شیون	:	نالہ و فریاد، آہ و زاری، ماتم
سینہ ریشاں	:	دل فگاراں، غمگین یا ملول لوگ، زخمی لوگ، عشاق
مہرکیشاں	:	مہر کرنے والے، مروت کرنے والے
خمیازہ کش	:	خمیازہ بھگتنے والا، نتیجہ بھگتنے والا
ناشکیبا	:	بے صبر، بہت مضطرب
واشد	:	انتشار، کشادگی، پھیلنا، وسعت، کھلنا، وا ہونا
غرفہ	:	جھروکا، کھڑکی
کودکان	:	کودک کی جمع، لڑکے، بچے
تصدیعات	:	تصدیع کی جمع، تکلیفیں، دکھ، زحمتیں
تظلم	:	فریاد، شکوہ، ظلم و ستم
اقل و اکثر	:	کم اور زیادہ
محافہ	:	ڈولی، پالکی، پینس
واژگوں	:	نامبارک، منحوس
مفرط	:	بہت زیادہ، افراط
نوشکیبی	:	بے صبری
استغنا	:	بے نیازی، بے رخی، بے التفاتی
طناز	:	ناز و انداز سے چلنے والا، عشوہ گر
فِشُردہ	:	نچوڑا ہوا، عرق نکالا ہوا
تلطف	:	مہربانی، عنایت، توجہ، التفات
عُمّاں/عمان	:	یمن کا ایک شہر، عرب کا جنوبی ساحل
لُجہ	:	پانی سے بھرا ہوا گہرا غار، منجدھار، طوفان، سمندر
تیرہ سحاب	:	کالے بادل، کالی گھٹا
رُکُوب	:	سوار، سوار ہونے کی کیفیت
قعر	:	گہرائی، تہہ
فرومایہ	:	کم ظرف
صبح گاہاں	:	صبح کے وقت، صبح گاہ
نصف النہار	:	دوپہر کا وقت
شگرف	:	عجیب، نادر، حیرت انگیز

دام گستر : پھانسنے والا، جال بچھانے والا

ہویدا : ظاہر، عیاں، نمودار

7.10 کتب برائے مطالعہ

۱۔ عجب سحر بیاں تھا : شمس الرحمٰن فاروقی

۲۔ میر اور مثنویات میر : وہاب اشرفی

۳۔ دریائے عشق اور بحر المحبت کا تقابلی مطالعہ : فرمان فتح پوری

۴۔ بیان میر : احمد محفوظ

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اکائی 8 میؔر کی مرثیہ نگاری اور مرثیہ ''ایمان یہ کیسا تھا کیسی یہ مسلمانی'' کی تدریس وتفہیم

ساخت

8.1 اغراض ومقاصد

8.2 تمہید

8.3 میؔر کی مرثیہ نگاری اور مرثیہ ''ایمان یہ کیسا تھا کیسی یہ مسلمانی'' کی تدریس وتفہیم

8.3.1 میؔر کی مرثیہ نگاری

8.3.2 منتخب متن کی تدریس وتفہیم

8.3.3 ماحصل

8.4 آپ نے کیا سیکھا؟

8.5 اپنا امتحان خود لیجیے

8.6 سوالوں کے جواب

8.7 فرہنگ

8.8 کتب برائے مطالعہ

8.1 اغراض ومقاصد

عزیز طلبا! اس اکائی میں آپ:

- میؔر کی مرثیہ نگاری کے متعلق معلومات حاصل کریں گے۔
- میؔر کی مرثیہ نگاری کے فکر وفن سے واقف ہوں گے۔
- میؔر کے مرثیوں کی قدر وقیمت سے روشناس ہوں گے۔
- شامل نصاب مرثیہ کی قرأت کریں گے۔
- شامل نصاب مرثیہ کی تشریح سے متعارف ہوں گے۔

8.2 تمہید

عزیز طلبا! سابقہ اکائی میں آپ نے میر کی مثنوی نگاری کے متعلق جانکاری حاصل کی۔ میر نے جس طرح بہت سی مثنویاں تخلیق کی ہیں، عین اسی طرح انھوں نے بہت سے مراثی بھی کہے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے میر ادبی دنیا میں اپنی غزل گوئی میں ہی معروف ہوئے۔ حالاں کہ انھوں نے بیشتر شعری اصناف میں اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ اردو مراثی میں بھی انھوں نے نمایاں کامیابی بھی حاصل کی ہے۔ ان کے مرثیوں میں سماجی زندگی کی جھلکیاں نظر

آتی ہیں اور واقعہ نگاری کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ اردو مرثیہ نگاروں میں میر کے ہم عصر سودا، مسکین، میر حسن، حزیں، غمگین، محب، عاجز، گدا، سکندر، حیدری، افسردہ وغیرہ خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ جس طرح میر غزل کے بادشاہ ہیں، اس طرح انھوں نے مرثیوں کو بلندی تک نہیں پہچایا ہے۔ لہٰذا آپ زیر نظر اکائی میں میر کی مرثیہ نگاری اور بطور نمونہ ان کے ایک مرثیہ کا مع تشریح مطالعہ کریں گے۔ تا کہ آپ ان کی مرثیہ نگاری کے مقام و مرتبے کو سمجھ سکیں۔

8.3 میر کی مرثیہ نگاری اور مرثیہ ''ایمان یہ کیسا تھا کیسی یہ مسلمانی'' کی تدریس و تفہیم

8.3.1 میر کی مرثیہ نگاری

میر تقی میر کی طبیعت مرثیے کی طرف ابتدا ہی سے مائل تھی، اس لیے انھوں نے اس فن کو پختگی اور ادبیت عطا کی۔ ایک طرف اگر مراثی میر سے اس عہد کی عزاداری کے رسوم و رواج کا علم ہوتا ہے۔ تو دوسری جانب گریہ و ماتم کے طور طریقہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ میر نے مربع، ترجیع بند، ترکیب بند اور مفردہ کی شکل میں مراثی کہے ہیں۔ میر کو امام حسین سے بے پناہ عقیدت تھی۔ کربلا کے المیے سے وہ بے حد متاثر ہیں۔ کربلا کے دل دوز اور جگر گداز مناظر کے بیان میں تکرار سے بھی کام لیا ہے۔ لیکن ہر بار تاثیر کی جداگانہ کیفیت قائم ہوئی ہے۔ میر نے مقصد شہادت حسینی کو لازمی طور پر پیش نظر رکھا ہے، جس میں امام حسین کی شخصیت کے کچھ اہم اور گراں قدر پہلو سامنے آ جاتے ہیں۔ میر کی زندگی خود ایک مرثیہ تھی۔ باپ چھوٹا سا چھوڑ کر مر گئے، بھائی کی بے رخی، ایذا رسانی اور دوسرے عزیزوں کی نامہربانی سے زندگی تلخی اور پریشانی میں گزری، جس سے دل بجھ گیا، طبیعت رندھ گئی۔ اس بجھے دل اور رندھی ہوئی طبیعت کو غزل میں پیش کر کے روتے اور رلاتے رہے۔ لکھنؤ پہنچے تو رونے رلانے کے لیے مرثیہ ہاتھ آ گیا۔ اب عمر بھی آخر ہو چلی تھی اس لیے اس صنف سخن کو اپنا لیا:

ہر چند شاعری میں نہیں ہے تری نظیر
اس فن کے پہلوانوں نے مانا تجھی کو میر
پر ان دنوں ہوا ہے بہت تو ضعیف و پیر
کہنے لگا جو مرثیہ، اکثر بجا کیا

میر نے فن کی پختگی اور استادی کی منزل پر پہنچ کر مرثیے کہے۔ طبیعت مرثیت پر پہلے ہی سے مائل تھی اس لیے بہت اچھے مرثیے کہے، جسے ادبی حیثیت اور مرثیت کے لحاظ سے بلند درجہ حاصل ہے۔ ان کے مرثیے میں غزل کا پیرایۂ بیان، اصطلاحیں اور مفرد طرز فکر بھی ملتی ہے۔ میر کے یہاں خیال کی بے پناہ بلندی ان کی یاس وحزن کی کیفیت کی وجہ سے ہے۔ ان کا غم و الم ان کے اشعار میں اس طرح ڈھلتا ہے کہ وہ دل میں اتر جاتا ہے۔ زبان کی فصاحت، سادگی، سوز و گداز مضامین کی جدت اور تاثیر ایسی خوبیاں ہیں جو اردو کے کسی بھی شاعر میں مجتمع نہیں۔

میرؔ کی مرثیہ نگاری اور مرثیہ ''ایمان یہ کیسا تھا کیسی یہ مسلمانی'' کی تدریس وتفہیم

ان کے مرثیوں میں اس وقت کے مراسم بھی ملتے ہیں۔میرؔ کے مرثیوں میں زبان اور بیان کا لطف ہے۔بین کے گوشے بھی ملتے ہیں۔ادب کا تقاضا بھی پورا ہوتا ہے اور مرثیے کا مقصد بھی ہاتھ سے نہیں جاتا۔ان کے کلام کے بارے میں محمد حسین آزادؔ اپنی رائے قائم کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''میرؔ صاحب کی زبان شستہ،کلام صاف،بیان پاکیزہ جیسے باتیں کرتے ہیں دل کے خیالات کو جو کہ سب طبیعتوں کے مطابق ہیں،محاورہ کا رنگ دے کر باتوں باتوں میں ادا کر دیتے ہیں اور زبان میں خدا نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتیں ایک مضمون بن جاتی ہیں۔اسی واسطے ان میں بہ نسبت اور شعرا کے اصلیت کچھ زیادہ قائم رہتی ہے بلکہ اکثر جگہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ نیچر کی تصویر کھینچ رہے ہیں۔یہی سبب ہے کہ دلوں پر اثر بھی زیادہ کرتی ہے گویا وہ اردو کے سعدیؔ ہیں۔''

(بحوالہ میر وسودا کا دور،ثناء الحق،ص:۲۶-۳۲۵)

میرؔ کے مرثیوں میں ان کا اپنا انداز ہے۔ان میں درد بھی ہے اور سوز بھی مگر ایسا نہیں کہ لوگ سنیں اور پھوٹ بہیں۔وہ حسین کے ثبات وعزم کے شیدائی ہیں جس کا ذکر اکثر ان کے مرثیوں میں ملتا ہے۔میرؔ کے مرثیوں میں روایتیں بھی ہیں۔ان کے مرثیوں میں کہیں کہیں پر تو اس وقت کے عام رجحانات کا بھی اشارہ ملتا ہے۔ مثلاً یزیدی فوج کی ذہنیت کو میرؔ نے دیکھیے کس طرح بیان کیا ہے:

یہ سن رکھ کہ ہم لوگ ہیں لشکری
نہ جانیں ہیں دیں کو نہ پیغمبری
ہمیں کوئی کچھ دے، کرے سروری
اشارات کر لے، تو کریں قتل عام

میر نے ۳۴ مرثیے اور ۷ سلام لکھے ہیں۔ان کے غم زدہ مزاج سے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ اس صنف سخن میں بھی غزل ہی کی طرح کمال کو پہنچیں گے۔چوں کہ اس صنف کا خاص مقصد جذباتی اثر پیدا کر کے غم والم کی ایسی کیفیت طاری کرنا ہے کہ سننے والا آہ وبکا کرنے لگے۔لیکن ان کے سارے مرثیوں کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ ان میں وہ اثر انگیزی نہیں ہے جو بعد کے دور میں انیسؔ و دبیرؔ کے یہاں ملتی ہے۔میر کے دور تک مرثیے کی ہیئت بھی مقرر نہیں ہوئی تھی۔میرؔ کے زیادہ تر مرثیے مربع کی ہیئت میں ہیں۔مسدس مرثیے تین ہیں اور تین مرثیے غزل کی ساخت میں ہیں۔ہاں سوداؔ نے مرثیے کے ارتقا میں بنیادی کام یہ کیا کہ اس میں تشبیب کا اضافہ کیا جو آگے چل کر چہرہ کہلایا۔میر کے مراثی میں تشبیب بھی نہیں ہوتی،وہ اپنا مرثیہ براہ راست مدح امام حسین سے شروع کر دیتے ہیں اور مدح میں جیسے وہ قصیدے میں کامیاب نہیں ہیں اسی طرح وہ مرثیوں میں بھی کامیاب نہیں ہیں۔وہ اپنے عقیدے کا اظہار ضرور کرتے ہیں،ان کے دل میں خلوص کی گرمی بھی ہے،مگر مرثیہ چوں کہ

داخلی شاعری نہیں ہے اس لیے اس میں جس خارجی انداز کی ضرورت تھی میر اس تک نہیں پہنچتے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ رونے کا عمل اسی وقت پیدا کیا جا سکتا ہے جب بتدریج جذباتی سطح کو ابھارا جائے اور پھر مصائب کا بیان ایسے موقع پر لایا جائے کہ سننے والا بے اختیار 'بکا' کرنے لگے۔ یہ ایک شعوری اور خارجی عمل ہے۔ برخلاف اس کے میر کے لیے اپنی ذات اور اس کے غم زیادہ اہم ہیں وہ جس خوبی سے اپنے غم عشق کو مثنویوں میں بیان کرتے ہیں اس طرح وہ دوسروں کے غم کا اظہار نہیں کر سکتے، یہ ان کی مجبوری ہے۔ انھوں نے اپنے مرثیے مجلسوں کی ضرورت کے لیے لکھے تھے اور ان میں مخصوص واقعات مثلاً: حضرت قاسم کی شادی، حضرت عابد کی اسیری، علی اصغر کی پیاس، خاندان حسین کی عورتوں کی بے حرمتی وغیرہ کو موضوع سخن بنایا ہے۔ ان موضوعات کو مرثیے میں نظم کرنے کی روایت دکنی مرثیوں سے شمال پہنچی اور پھر میرؔ کے مرثیوں سے ہوتی ہوئی میر انیسؔ کے مرثیوں میں اپنے کمال کو پہنچی۔ اسی طرح میر نے اپنے مرثیوں میں سہل ممتنع کا طرز اختیار کیا جسے بعد میں میر انیسؔ نے اسے کمال تک پہنچایا۔

میر کے مرثیوں میں حزن وملال کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ خاص طور سے کربلا کے انھی واقعات کو مرثیے کے لیے انتخاب کیا ہے جو بہت دردناک خیال کیے جاتے ہیں۔ ان کو مقصد شہادت حسین کا احساس زیادہ ہے۔ اسی لیے انھوں نے اپنے مرثیوں میں بار بار ان کے کردار کے مختلف پہلوؤں اور ان کی عظمتوں پر زور دیا ہے۔ ان کے یہاں مسلسل واقعہ نگاری کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں، البتہ ایسے ٹکڑے ضرور ملتے ہیں جن کو معمولی واقعہ نگاری کا نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے، مثلاً:

بھائی بھتیجے خویش و پسر یاور اور یار
جاویں گے مارے آنکھوں کے آگے سب ایک بار
ناچار اپنے مرنے کا ہوگا امیدوار
ہے آج رات اور یہ مہمان روزگار

ان کے یہاں مراثی میں ادبی شان پیدا کرنے یا صنائع بدائع کے استعمال کی کوئی شعوری کوشش نہیں ملتی ہے۔ بلکہ سراسر سوز اور تعزیت کا انداز ملتا ہے۔ ان کے بیشتر مراثی تمام اسقام (عیوب) شعری سے پاک ہیں، جسے عوام و خواص دونوں سن کر یکساں روحانی لطف اٹھا سکتے ہیں۔ انھوں نے درحقیقت امام حسین کے بلند مقصد، مظالم پر صبر اور بے پناہ جذبۂ ایمانی کی پر اثر تصویریں کھینچی ہیں، جس میں ایک خاص قسم کا تسلسل ہے، سادگی ہے اور درد انگیزی بھی۔ میر کے مرثیوں کی اسی خصوصیت پر خلیقؔ اور دلگیر نے اپنے بینیہ مراثی کی بنیاد استوار کی ہے۔

میر نے مرثیوں میں اپنے زمانے کے رسوم اور معاشرت کے عناصر بھی داخل کیے ہیں، جن کے مطالعے سے اس زمانے کی عزاداری کے متعلق بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جو اب غالباً متروک ہیں۔ مثلاً نوحہ و ماتم میں

میرؔ کی مرثیہ نگاری اور مرثیہ ''ایمان یہ کیسا تھا کیسی یہ مسلمانی'' کی تدریس وتفہیم

جس طرح آج کل حسین حسین، حسین امام حسین، حسن حسین، یا حسین شاہ حسین کی صدائیں لگائی جاتی ہیں۔اسی طرح اس وقت ''ہے دوست ہے دوست'' کی صدائیں لگانے کا بھی رواج تھا۔محرم میں لوگ سیاہ کپڑے کا کفن پہن کر اظہار غم کے لیے نعل اور لوہے کی دوسری چیزوں کو گرم کر کے اپنے جسم کو داغ لیا کرتے تھے۔میر کے بعض مرثیے ایسے بھی ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ ماتم کے ساتھ پڑھنے کے لیے لکھے گئے ہیں۔ان کی بحروں سے پرانے طرز کی سینہ زنی کے آہنگ اور اتار چڑھاؤ کا صاف اندازہ ہوتا ہے۔حضرت قاسم کی شادی اردو مرثیہ گویوں کا خاص موضوع رہا ہے۔میرؔ و سوداؔ نے بھی اس میں بہت سے پہلو نکالے ہیں۔میر نے ایک مرثیہ ''قاسم کی شادی اس دن رچائی'' تو اسی مضمون سے شروع کیا ہے اور اس میں ہندوستانی شادی کے رسوم، برات، سہرا، لگن دھرانا، آرسی مصحف، آتش بازی، معجز، نیگ وغیرہ کے ذکر سے درد پیدا کیا ہے۔میر کے مرثیے میں امام حسین کے کردار کی بلندی اور حق کی حمایت میں جان کی قربانی دینے کے اشارے ملتے ہیں۔حضرت قاسم کا امام حسین سے میدان کی اجازت چاہنا، ان کا انکار، پھر حضرت قاسم کا بازو کا تعویذ دکھانا، امام کا حضرت قاسم کو لے کر خیمے میں جانا، دلھن سے ان کی رخصت اور میدان میں جا کر شہادت پانا، امام حسین کی شہادت کے بعد عورتوں کی فریاد اور حضرت عابد کی مصیبت، ان کی ذمہ داریاں، ان کی بے چارگی اور تنہائی کے بیانات وغیرہ میر کے خاص موضوعات ہیں۔انھوں نے اپنے مراثی کا بنیادی مقصد محدود مذہبی نقطۂ نظر سے گریہ و بکا ہی قرار دیا۔انھوں نے گریہ وبکا اور بین و ماتم کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں کربلا سے زیادہ اپنے عہد اور اپنے گرد و پیش کے ماحول کی تصویر کشی کی ہے۔بیٹے کی لاش پر ماں کی بین، امام حسین کی بہن اور اہل حرم سے رخصت کا منظر اور حضرت فاطمہ کی روح کا میدان کربلا میں آ کر گریہ وبکا کرنا ایسے مناظر ہیں جن کو میر نے بڑے اہتمام سے نظم کیا ہے۔انھوں نے بالخصوص اپنے مرثیوں میں گریہ خیز پہلو بہت پیدا کیے ہیں اور کربلا کے واقعات میں سے درد انگیز مناظر منتخب کر کے انھیں بار بار نظم کیا ہے۔مثلاً حضرت علی اصغر کے لیے پانی کا سوال، امام حسین کی شہادت اور اس کے بعد کی لوٹ مار، حضرت عابد کی اسیری، اہل حرم کی بے چادری، حضرت قاسم کی شادی وغیرہ۔بحیثیت مجموعی میر کے مراثی ادبی اور تاریخی دونوں حیثیت سے گراں قدر ہیں۔

8.3.2 منتخب متن کی تدریس وتفہیم

عزیز طلبا! آیئے اب ہم شامل نصاب میر تقی میرؔ کے مرثیہ کی قرأت کرتے ہیں:

(۱)

ایمان یہ کیسا تھا کیسی یہ مسلمانی
کی آل پیمبر سے جو دشمنی جانی
بے آبی میں کشتی تھی شبیر کی طوفانی
دریا کے کنارے پر اس کو نہ ملا پانی

(۲)

کیا گوہر تر لاکر کس گھاٹ اتارا ہے
لب خشک جگر ٹکڑے بے یاور و یارا ہے
سب خویش و پسر بھائی ایک ایک کو مارا ہے
ہے قہر نہ پانی پر یہ پیاس کی طغیانی

(۳)

انواع ستم گزرے بہتوں کو جواں مارا
جو جاکے گھرا تنہا میداں میں عیاں مارا
انصار کو یاں مارا اعوان کو واں مارا
عباس کی بے جانی اصغر کی وہ نادانی

(۴)

بازو نہ رہا کوئی اس درد کا کیا چارہ
کیا لطف ہے جینے کا کنبہ مرے جب سارا
پھر دیدہ و دانستہ اپنے ہی تئیں مارا
سب شہر بیابانی گھر بار کی ویرانی

(۵)

یہ حشر میں احمد کو منہ کیونکے دکھائیں گے
کیا سامنے حیدر کے رو لے کے پھر آئیں گے
دیکھیں گے جو زہرا کو کیا بات بنائیں گے
اے واہ ری دیں داری،اللہ ری خدا خوانی

(۶)

کیا شام کے لوگوں نے فتنے کو جگایا ہے
اولاد کو حیدر کی سب جن نے سلایا ہے
یہ جور یہودوں سے کس دور میں آیا ہے
اس طور سے پیش آئے کب کفری و نصرانی

(۷)

آنکھیں جو مندیں شہ کی آشوب سا اک آیا
اسباب گیا سارا خیمہ کو جلا پایا

عریاں سر و بے چادر نسواں نہ جنھیں سایہ
اس جمع میں یک باری کیا آئی پریشانی

(۸)

غارت ہوا ناگاہے اسباب امیرانہ
مردم حرم شہ کے نکلے ہو فقیرانہ
عابد کے تئیں لائے میداں میں اسیرانہ
وہ یوسف ثانی تھا جیسے کہ ہو زندانی

(۹)

دل سینے میں صد پارہ بے طاقت و بے چارہ
ناموس بیاباں میں یک شہر تھے آوارہ
سر باپ کا نیزہ پر کرتا تھا جو نظارہ
چاہے تھا کہ ناخن سے نوچوں سر و پیشانی

(۱۰)

پر دست نہ تھا اس کو تھے ہاتھ رسن بستہ
رہ جاتا تھا سر دھن کر ناکام جگر خستہ
کہتا تھا پدر مر کر تو تو ہوا وارستہ
مجھ قیدی کی مشکل کی آساں نہیں آسانی

(۱۱)

لاشوں کی طرف ہو کر نکلے جو اساریٰ سب
خون جگر آنکھوں میں فریاد تھی زیر لب
کرتی ہے نظر یک سو تو دیکھے ہے کیا زینب
ہے بھائی کے پیکر کو اس خاک میں غلطانی

(۱۲)

گر خاک میں چلائی کیا جرم ہوا بھائی
جو سر کو کٹا تو نے ہموار کی تنہائی
کر سیر چمن اپنا آفت عجب اک آئی
کیا باد خزاں نے کی جنگل میں گل افشانی

(۱۳)

نورستہ نہال اس کے یک دست چھٹے ہیں گے
اشجار سر و بن سے دیکھو تو کٹے ہیں گے
گل پھول چڑھے چڑھ کر ماٹی میں اٹے ہیں گے
اس رنگ کی دیکھی ہے خاموشی و حیرانی

(۱۴)

یاں آن کے جانا تھا ہوگی تری عزت بھی
حیدر کا خلف ہے تو ہے تجھ کو امامت بھی
خاطر کریں گے تیری بھیجیں گے اقامت بھی
سو قوم سیہ دل نے کیا خوب کی مہمانی

(۱۵)

کیوں تاج شہی تیرا ہے خاک برابر یوں
کیوں مارے گئے تیرے سب خویش و برادر یوں
کیوں سر کے تئیں رکھا لے نیزے کے اوپر یوں
برباد کیا بارے کیوں تخت سلیمانی

(۱۶)

پر گرد بیاباں میں آوارہ ہوئے از بس
بیچارہ و بے وارث بے جاہ و مکاں بے کس
جا بیٹھیں کہیں چھپ کر اپنا جو چلے کچھ بس
کیا دیکھی ہے رسوائی کیا خاک ہے یاں چھانی

(۱۷)

احمد نہیں ہے جس کو یہ حال دکھاویں ہم
حیدر نہیں جس پاس اب روتے ہوئے جاویں ہم
عباس نہیں جس کو اس وقت بلاویں ہم
تو تھا سو مٹا تیرا ہنگامۂ سلطانی

(۱۸)

ہے زندگی کچھ یہ بھی تھی موت بھلی اس سے
سر کب تئیں یوں ماریں فریاد کریں کس سے

اکبر کی توقع تھی ہم سب کے تئیں جس سے
بے وقت گیا مارا سو وہ نبی ثانی

(۱۹)

قاسم کی طرف گاہے پڑتی تھی نظر جاکر
اس مخمصے میں شاید امداد کرے آکر
سر دے گیا سو آگے تہ بات کی کچھ پاکر
عشرت نہ جوانی کی اس دل زدہ نے جانی

(۲۰)

ہم شام کو جاتے ہیں فرصت نہیں ہے ہم کو
بے طاقتی سے مطلق طاقت نہیں ہے ہم کو
تاکید سے چلنے کی مہلت نہیں ہے ہم کو
آنکھوں سے کریں ورنہ سب تیری نگہبانی

(۲۱)

یہ کہہ کے گئے آگے روتے ہوئے غم دیدہ
اب تو بھی قلم رکھ دے اے میرؔ ستم دیدہ
بس گریہ سے خامے کے کاغذ تو ہے نم دیدہ
دیوانگی کر اس جا پر یاں عقل ہے دیوانی

تشریح

(۱)

میرتقی میرؔ کے مرثیوں میں درد وغم ہے۔ جذبات واحساسات کی تصویرکشی ہے۔ سوز وگداز ہے۔ بین کے اشعار میرؔ کے یہاں مختلف انداز میں پائے جاتے ہیں۔ کربلا کے دل دوز اور جگر گداز مناظر کے بیان کو میرؔ نے اپنے مرثیوں میں پیش کیا ہے۔ مرثیہ کے اس بند میں میر کہتے ہیں کہ حضرت امام حسین کے جو مخالف تھے یعنی یزیدی، وہ بھی مسلمان تھے، لیکن ایمان کی ذرا بھی ان میں حرارت نہ تھی، کیوں کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آل کے جانی دشمن تھے جو ایک مسلمان کے شان کے خلاف ہے۔ حضرت امام حسین کے لشکریوں میں پیاس کی شدت تھی لیکن انھیں دریا کے کنارے ہونے کے باوجود پانی پینے کو نہیں ملتا تھا۔ یعنی یزیدی فوج نے اہل بیت پر اس قدر ظلم کیا کہ معصوم بچوں کو بھی دریا سے پانی پینے نہیں دیا۔

(۲)

اسیران کربلا کو تقدیر نے یا امید خلافت نے یا خود امام عالی مقام نے کس عجیب پریشانی ومشکل گھاٹ پر اتارا ہے کہ سبھی اہل کربلا کی پیاس کی وجہ سے لب خشک ہیں اور افتاد مصیبت سے ان کے جگر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں اور اس بے چارگی کی حالت میں ظاہری طور پر ان کا کوئی یار و مددگار نہیں ہے۔ یزیدی اور کوفیوں نے حضرت امام عالی مقام کے بیٹوں، بھائیوں اور رشتے داروں کو ایک ایک کر کے شہید کر دیا۔ اس پیاس کی شدت وطغیانی کے باوجود نہر فرات اپنی خواہش کے باوجود اہل بیت کو پانی نہ پلا سکا۔ یہ بات نہر فرات پر قہر ہی ہے۔

(۳)

یزیدی فوج کے ظلم و بربریت کا ذکر کرتے ہوئے میرؔ کہتے ہیں کہ ظلم وستم کی انتہا یہ تھی کہ بہت سے نوجوانوں کو یزیدیوں نے بے دردی سے شہید کر دیا۔ یزیدیوں کے لشکر کے نرغے میں جو امام حسینؓ کے سپاہی گھرے تو انھیں سرعام قتل کیا گیا۔ تمام انصار اور مددگار کو مارا گیا حتیٰ کہ بہادر حضرت عباس اور بچے حضرت علی اصغر کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

(۴)

حضرت امام حسینؓ کا کوئی حامی ومددگار نہ بچا، سخت آزمائش میں آپ مبتلا کیے گئے۔ آپ کے خاندان کے ہر فرد کو شہید کیا گیا (حضرت امام زین العابدین کے علاوہ) یزیدیوں نے جان بوجھ کر اپنے ہوس، لالچ اور خود غرضی کی تکمیل کے لیے امام حسینؓ کے پورے کنبے کو برباد اور ویران کر دیا گیا۔

(۵)

اس بند میں شاعر نے سوال پیدا کیا ہے کہ یہ یزیدی میدان محشر میں حضورؐ کے روبرو کیسے ہوں گے؟ انھیں شرم نہیں آئے گی کہ حضرت علیؓ کو اپنا چہرہ کیسے دکھائیں گے۔ حضرت بی بی فاطمہؓ کے سامنے قتل حسینؓ کا کیا جواز پیش کریں گے۔ ہائے یہ کیسے مسلمان اور خدا کے نام لیوا ہیں کہ اپنے ہی پیغمبرؐ کے آل اولاد کو شہید کر دیا۔ لعنت ہے ایسی دین داری پر۔ اس بند میں میر نے دراصل یزیدیوں کی بے پرسان حالی کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے، جو نہ دنیا کے رہے اور نہ ہی دین کے۔

(۶)

یہ بند بھی سابقہ بند سے بہ اعتبار خیال مربوط ہے۔ شاعر نے اس بند میں اہل بیت پر ہونے والے ظلم وجبر کو بہت ہی جذباتی انداز میں بیان کیا ہے۔ اس بند میں کہا جا رہا ہے کہ شام کے لوگوں نے یہ کس طرح کی زیادتی کی ہے

کہ حضرت علی کے اولاد کو قتل کیا۔ اس طرح کا ظلم وستم یہودیوں نے بھی نہیں کیا ہے، نصرانیوں اور کافروں نے بھی حضرت علی کے اہل وعیال کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا ہے، لیکن شامیوں نے مسلمان ہونے کے باوجود ایسا گھناونا کام کیا ہے کہ تاریخ میں اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی ہے۔

(۷)

میر نے اس بند میں حضرت امام حسین کی شہادت کے بعد کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس منظر میں پس ماندہ حرم اہل بیت کی بے سروسامانی اور پریشانی کو بہت احسن طریق سے نظم کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جیسے ہی امام حسین جام شہادت نوش کرتے ہیں، یزیدی لشکر آپ کے خیمے کو لوٹ لیتے ہیں اور سارے سامانوں کو جلا ڈالتے ہیں۔ عورتوں کے سر سے چادر کھینچ لی جاتی ہے۔ پردہ کی حرمت کو پامال کر دیا جاتا ہے۔ یہ سب کام ان بدبختوں نے چند ساعت میں حضرت امام حسین کے پس ماندگان کے ساتھ کیا۔

(۸)

اس بند میں بھی اوپر کے خیال کی ہی توسیع کی گئی ہے۔ یہاں یہ بیان کیا جارہا ہے کہ ایک ہی لمحے میں تمام شاہی ساز وسامان برباد ہو گئے۔ امام حسین کے خیمے کے بقیہ حضرات بے بسی اور مفلسی کے عالم کا شکار ہو گئے، ظالموں نے انتہا یہ کہ حضرت امام زین العابدین (عابد بیمار) کو بھی قیدیوں کی شکل میں خیمے سے باہر لایا گیا۔ یہاں پر شاعر نے حضرت امام زین العابدین کو یوسف ثانی سے تعبیر کیا ہے کہ جس طرح بے قصور حضرت یوسف علیہ السلام بہت خوبصورت ونیک سیرت ہونے کے باوجود انہیں جیل میں ڈالا گیا تھا۔ اسی طرح آج معصوم و بے گناہ اور نیک سیرت، بیمار بچے حضرت امام زین العابدین زندان میں مقید کر دیا گیا۔

(۹)

حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کی وجہ سے خانوادہ کے سبھی افراد کے دل رنجیدہ ہو گئے تھے اور یہ سب دیار غیر میں بے یار ومددگار اجڑے ہوئے چمن کی طرح ہو گئے تھے۔ حضرت امام زین العابدین کا حال یہ تھا کہ وہ اپنے والد حضرت امام حسین کا سر نیزے پر دیکھ کر اپنے ہاتھوں سے سر وپیشانی کو نوچنا چاہتے تھے۔

(۱۰)

لیکن حضرت امام زین العابدین کو یہ قدرت نہیں تھی کہ وہ اپنی سر وپیشانی کو نوچ سکیں، کیوں کہ یزیدی فوج نے آپ کے دونوں ہاتھوں کو رسی سے باندھ رکھا تھا۔ ناکام اور دل برداشتہ امام زین العابدین اپنے جذبات پر نا خواستہ قابو رکھ کے اپنے والد یعنی حضرت امام حسین سے شکایت کے لہجے میں کہتے کہ آپ تو شہید ہو کر اپنی راہ

چلے، لیکن مجھ قیدی کی مشکل آسان ہونے کی کوئی صورت نہیں دکھائی دے رہی ہے۔

(۱۱)

معرکۂ کربلا کے بعد امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر والے قید کی حالت میں جب کربلا میں شہید ہوئے لوگوں کی نعش (لاش) کے قریب سے گزرے تو ان کے آنکھوں میں خون جگر موجزن تھا اور زیر لب شکایت کناں تھے۔ حضرت زینب نے میدان کربلا میں دیکھا کہ ان کے بھائی امام حسین کا جسم اقدس خاک سے اٹا ہوا ہے۔

(۱۲)

حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بھائی کے اس منظر کو دیکھ کر نہایت غم ناکی کی حالت میں زمیں پر گر کر ماتم کناں ہوئیں اور چلا کر کہا کہ اے میرے بھائی ہم سے کیا خطا ہوگئی کہ آپ ہم سے روٹھ کر چلے گئے اور ہم کو تنہائی میں چھوڑ دیا ہے۔ آپ تو جنت کے باغات کی سیر کریں گے لیکن ہم سبھوں کے لیے آفت یہ ہے کہ بادخزاں نے جنگل میں پھولوں کو جھاڑ دیا ہے۔ یعنی یزیدیوں نے آپ کے چمن کو برباد کر دیا ہے۔

(۱۳)

کربلا سے واپسی کے وقت پس ماندگان کربلا قید و بند میں ہیں، لیکن دوران سفر دین کے دشمن حضرت امام زین العابدین (عابد بیمار) کے ایک ہاتھ کو بندھ سے آزاد کر دیتے ہیں۔ اسی مضمون کی منظرکشی کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ حضرت زین العابدین کا ایک ہاتھ آزاد ہونے سے اسیران کربلا کو خوشی ہے۔ لیکن قید و بند میں رکھنے کی وجہ سے ان کی حالت اسی طرح پژمردہ ہے جیسے کہ درخت کی شاخیں، پتیاں اور پھل اپنی جڑ سے کٹ جانے کی وجہ سے پژمردگی اور بے رونقی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ حقیقتاً جب برگ و بار و ثمر اپنے شباب پر ہوں اور باغ میں ہر طرف بہار ہی بہار ہو اور پھر کوئی شخص آ کر اس رنگ کو پامال کر دے تو ہو یعنی ویرانی سا عالم پیدا ہو جاتا ہے۔ جس میں حیرانی اور خاموشی ہوتی ہے، اسی طرح اہل بیت کے چمن کو تہ و تیگ کر دینے سے اسیران کربلا پر حیرانی و خاموشی کی کیفیت ہے۔

(۱۴)

مرثیہ کے اس بند میں حضرت زینب طنزیہ کہہ رہی ہیں کہ کوفیوں کے بلاوے پر ہمیں یہ یقین تھا کہ ملک شام میں ہماری خوب عزت و توقیر ہوگی۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ کی اولاد میں ہونے کی وجہ سے حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لوگ اپنا پیشوا اور امام تسلیم کریں گے اور خوب خاطر و تواضع کریں گے، لیکن ہائے ان سیاہ دل اور بد بختوں نے کیسی بدسلوکی کے ساتھ ہماری مہمان نوازی (توہین) کی ہے۔

(۱۵)

اس بند میں حضرت زینب تذبذب کے عالم میں متعدد سوال کرتی ہیں کہ کیوں یزیدیوں نے آپ کے تاج شاہی کو نیست و نابود کیا؟ کیوں ان ظالموں نے آپ کے سبھی اپنوں اور بھائیوں کو تہہ وتیغ کر دیا ہے؟ کس وجہ سے آپ کے سر کو نیزے کے اوپر رکھ کر بلند کیا گیا ہے؟ کیوں آپ کے تخت سلیمانی کو برباد کیا گیا ہے۔یعنی اس بند میں حضرت زینب کی آہ وزاری کو بہت جزئیاتی سطح سے میر نے بیان کیا ہے۔

(۱۶)

یہ بند بھی بین پر مبنی ہے ۔ اس بند میں پس ماندہ حرم اہل بیت کی بے بسی ، بے کسی اور ناکامی کو بیان کیا گیا ہے۔حضرت زینب بین کرتے ہوئے کہہ رہی ہیں کہ پرگرد بیابان میں بے سروسامانی اور لاوارثی کی حالت میں ہم لوگ بھٹک رہے ہیں، یہاں ہمارا کوئی یار و مددگار نہیں ہے اور نہ ہمارے لیے کوئی جائے پناہ ہے اور نہ ہی مکاں ۔اگر ہمارا بس چلتا یعنی طاقت ہوتی تو کہیں چھپ کر بیٹھ جاتی، کیوں کہ اس قدر رسوائی و پریشانی سے نجات پانے کا بس یہی ذریعہ ہے۔

(۱۷)

حضرت زینبؓ حضرت امام حسینؓ کی نعش سے مخاطب ہو کر کہتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہیں کہ ہم اپنی حالت زار انھیں جا کر دکھائیں۔حضرت علیؓ بھی نہیں ہیں کہ ہم اپنی فریاد لے کے ان کے پاس جائیں ، یہاں تک کہ حضرت عباسؓ بھی نہیں ہیں کہ ہم ان سے مدد طلب کریں ۔بس ایک آپ ہی تھے ہمارے پاس ،سو ظالموں اور دین کے دشمنوں نے تمہاری سلطانی کو بھی چھین لیا یعنی شہید کر دیا۔

(۱۸)

میدان کربلا میں حسینی افراد اپنی حالت زار کا ذکر کرتے ہوئے سوز وغم کی صورت حال میں فریاد کناں ہیں کہ یہ زندگی کوئی زندگی ہے اس سے اچھی تو موت ہی ہے، کب تک سرگرداں پھرتے رہیں اور کس سے اپنی فریاد کریں ۔ہاں علی اکبر جس سے ہماری امیدیں وابستہ تھیں کہ ہم اسی کے سہارے جی لیتے ،لیکن ہائے ان بدبختوں نے اسے بھی میدان کربلا میں بے وقت شہید کر دیا۔

(۱۹)

حضرت قاسمؓ امام حسنؓ کے صاحب زادے اور حضرت زینب کے بھتیجے ہیں،حضرت زینبؓ کی جب ان کی نعش کی طرف نگاہ پڑتی ہے تو بڑی امیدوں کے ساتھ کہتی ہیں کہ شاید اس مشکل وقت میں یہ ہماری مدد کرے گا،لیکن

جب دیکھتی ہیں کہ ظالموں نے انہیں بھی نہیں بخشا اور شہید کر دیا ہے۔ تو بے ساختہ منھ سے نکلتا ہے کہ ہائے اس غمزدہ بھتیجے نے جوانی کی عیش و عشرت کو بھی نہیں دیکھا۔

(۲۰)

حضرت زینبؓ کہتی ہیں کہ ہم لوگوں کو نہ چاہتے ہوئے بھی قیدیوں کی شکل میں ملک شام لے جایا جا رہا ہے، ہم قید و بند کی مصیبتوں اور تکلیفوں کی وجہ سے بے بس اور لاچار ہیں۔ دشمنوں نے یہاں ہمیں ٹھہرنے کی بھی مہلت نہیں دی، ورنہ اے شہیدان کربلا! ہم سبھی لوگ آپ کو چھوڑ کر ہرگز نہیں جاتے، بلکہ آپ لوگوں کی اپنی آنکھوں سے نگہبانی اور رکھوالی کرتے۔

(۲۱)

اس بند کے پہلے مصرعہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت زینبؓ نے شہیدان کربلا کے اظہار تاسف میں آہ و بکا کر کے غمگین اور نمناک آنکھوں کے ساتھ آگے بڑھ گئیں۔ مصرعۂ ثانی میں میرؔ خود کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ اے میر! ستم دیدہ (ستم دیکھنے والا) اب تو بھی حالات کربلا کو لکھنا بند کر کیوں کہ قلم کے رونے کی وجہ سے کاغذ بھی اشک بار ہو گیا ہے۔ دیوانگی کی جگہ یہاں نہیں ہے کیوں کہ عقل کی دیوانگی اب مزید لکھنے کی اجازت نہیں دیتی ہے۔

8.3.3 ماحصل

عزیز طلبا! مذکورہ گفتگو کا ماحصل یہ ہے سانحۂ کربلا ذاتی اندوہ وغم کی حدوں سے گزر کر ایک ہمہ گیر انسانی دکھ درد کی داستان بن گیا ہے۔ لہٰذا مرثیوں میں میر کا غم سطحی اضطراب اور بے صبری کا مظہر نہیں بلکہ مسلسل تجربات اور ان کے روحانی ردعمل کا نتیجہ ہے۔ مراثی میر کے مطالعہ سے ہمارے جذبات و خیالات اور ہمارے احساسات و نظریات میں وہ ضبط اور سنجیدگی پیدا ہوتی ہے، جس کو صحیح معنوں میں تحمل کہتے ہیں۔ فنی سطح پر میر کے مرثیہ میں الفاظ اپنے موضوع اور مضمون سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ پیکر تراشی اور خیال انگیزی بھی کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ ان کے بند میں ہر لفظ موتی کی طرح جڑے ہوئے نظر آتے ہے۔ وہ اپنے انداز بیان کی وجہ سے واقعات کربلا کی پیش کش میں درد وغم کی کیفیت سے قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کی مرثیہ نگاری اس درجہ کو نہیں پہنچتی جہاں بعد کے مرثیہ نگاروں نے اپنی تخلیقی قوت سے اسے بلندی پر پہنچایا ہے۔ شامل نصاب مرثیہ کی قرأت اور اس کی تفہیم سے باوثوق کہا جا سکتا ہے کہ مرثیہ نگاری کے میدان میں ہمیں وہ میر نہیں ملتے، جو غزل میں نظر آتے ہیں۔ یہاں ان کے زور تخیل کی کارفرمائی سست اور کند ہے۔ جس کا بنیادی سبب غالباً یہ ہے کہ اس وقت تک مرثیہ محض مذہبی عقیدت تک ہی محدود تھا، جب کہ بعد کے آنے والے

عہد میں مذہبی عقیدت کے اظہار سے کہیں زیادہ مرثیہ گوئی کمال سخن اور مہارت فن کا ذریعہ بن گئی تھی۔

8.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- میرؔ کی مرثیہ نگاری کی خصوصیات و امتیازات سے واقفیت حاصل کی۔
- میرؔ کے مرثیوں کے موضوعات و مضامین اور ان کے فکری رجحان کو جانا۔
- میرؔ کے مرثیوں کے مقام و مرتبہ سے آگہی حاصل کی۔
- شامل نصاب میر کے مرثیہ کی قرأت کی۔
- شامل نصاب میر کے مرثیہ کی تشریح و توضیح سمجھی۔

8.5 اپنا امتحان خود لیجیے

ا۔ میرؔ کی مرثیہ نگاری کی اہم خصوصیات کو مختصراً تحریر کیجیے۔
۲۔ میرؔ کے عہد کے اہم مرثیہ نگاروں کے نام بتائیے۔
۳۔ میرؔ نے مرثیے کے کس جزو پر زیادہ زور دیا ہے؟ مختصراً واضح کیجیے۔
۴۔ میرؔ کے رثائی سرمائے کی تعداد اور ساخت کی نشان دہی کیجیے۔
۵۔ شامل نصاب مرثیہ کے تیرہویں بند کی تشریح کیجیے۔

8.6 سوالوں کے جواب

ا۔ مرثیہ نگاری میں میر کی خصوصیات یہ ہے کہ ان کے مرثیوں کا ایک منفرد انداز ہے جس میں درد، سوز اور جذبات و احساسات کی تصویر کشی ہے۔ انھوں نے امام حسین کے ثبات عزم کے موضوعات باندھنے میں خاص توجہ صرف کی ہے۔ ان کے مراثی میں حزن و ملال کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ بالخصوص انھوں نے کربلا کے دردناک حالات واقعات کو ہی نظم کیا ہے۔ ان کے مرثیوں سے ان کے عہد کے طور طریقے، رسوم اور معاشرت کو سمجھنے میں آسانی فراہم ہوتی ہے۔ ان کے مراثی کی زبان و بیان عام فہم اور بامحاورہ ہے۔ ان کے مرثیوں کا ہیولیٰ تخلیقیت سے کہیں زیادہ اظہار عقیدت پر مبنی ہے۔

۲۔ میرؔ کے عہد کے اہم مرثیہ نگاروں میں سوداؔ، مسکینؔ، حزیںؔ، غمگینؔ، گداؔ، عاجزؔ، محبؔ، سکندرؔ، میر حسنؔ، حیدریؔ، افسردہؔ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

۳۔ میر نے اپنے مرثیہ میں بینیہ پہلو پر زیادہ زور صرف کیا ہے۔ حضرت امام حسین کی بلند کرداری اور ان کے مقاصد اعلیٰ کی قربانی کو موضوع سخن کیا ہے۔ گریہ و بکا اور بین و ماتم کی جو تصویر کشی مثلاً: بیٹے کی لاش پر ماں کی بین، امام حسین کی بہن اور اہل حرم سے رخصت کا منظر وغیرہ ایسے موضوع ہیں جو انسان کو ذہنی طور پر بین کے لیے مجبور کر دیتے ہیں۔

۴۔ میر نے اپنے رثائی سرمائے میں ۳۴ مرثیے اور ۷ سلام بطور یادگار چھوڑے ہیں۔ انھوں نے گرچہ مسدس، مربع کے علاوہ اور متعدد ساخت میں مرثیے کہے ہیں لیکن ان کے مراثی میں مربع کی ہیئت سب سے زیادہ ہے۔

۵۔ تیرہویں بند کی تشریح:

نورستہ نہال اس کے یک دست چھٹے ہیں گے
اشجار سرو بن سے دیکھو تو کٹے ہیں گے
گل پھول چڑھے چڑھ کر ماٹی میں اٹے ہیں گے
اس رنگ کی دیکھی ہے خاموشی و حیرانی

کربلا سے واپسی کے وقت پس ماندگان کربلا قید و بند میں ہیں، لیکن دوران سفر دین کے دشمن حضرت امام زین العابدین (عابد بیمار) کے ایک ہاتھ کو بندھ سے آزاد کر دیتے ہیں۔ اسی مضمون کی منظر کشی کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ حضرت زین العابدین کا ایک ہاتھ آزاد ہونے سے اسیران کربلا کو خوشی ہے۔ لیکن قید و بند میں رکھنے کی وجہ سے ان کی حالت اسی طرح پژمردہ ہے جیسے کہ درخت کی شاخیں، پتیاں اور پھل اپنی جڑ سے کٹ جانے کی وجہ سے پژمردگی اور بے رونقی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ حقیقتاً جب برگ و بار و ثمر اپنے شباب پر ہوں اور باغ میں ہر طرف بہار ہی بہار ہو اور پھر کوئی شخص آ کر اس رنگ کو پامال کر دے تو ہو یعنی ویرانی سا عالم پیدا ہو جاتا ہے۔ جس میں حیرانی اور خاموشی ہوتی ہے، اسی طرح اہل بیت کے چمن کو تہ و تیغ کر دینے سے اسیران کربلا پر حیرانی و خاموشی کی کیفیت ہے۔

8.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
آل پیمبر	:	پیغمبر کی اولاد
بے آبی	:	پانی کی غیر موجودگی
لب خشک	:	خشک، (سوکھے ہوئے) ہونٹ
گوہر تر	:	بھیگے موتی (بہ مراد امام حسینؓ)

خویش	:	عزیز، بھائی
پسر	:	بیٹا
انصار	:	(ناصر کی جمع) مددگار
اعوان	:	(عون کی جمع) مددگار
دیدہ و دانستہ	:	جان بوجھ کر
فتنہ جگانا	:	زیادتی کرنا
آشوب	:	بدحالی
نسواں	:	عورتیں
یوسف ثانی	:	یوسف علیہ السلام کے مثل، یعنی امام زین العابدین
زندانی	:	قیدی
ناموس	:	آبرو، شرم
ہاتھ رسن بستہ	:	ہاتھ بندھے ہونا
جگر خستہ	:	دل برداشتہ
پدر	:	باپ، والد
وارستہ	:	آزاد
خلف	:	وارث، اولاد
نبی ثانی	:	حضرت علی اکبر
مخمصہ	:	جھگڑا، مشکل وقت
تہ بات	:	بات کی حقیقت سمجھ کر
ستم دیدہ	:	ستم دیکھنے والا
کاغذ نم دیدہ	:	کاغذ کا اشک بار ہونا
تاکید	:	اصرار، ضد

8.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ مراثی میر : سید مسیح الزماں

۲۔ تاریخ ادب اردو : جمیل جالبی

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

۳۔	اردو مرثیے میں ہیئت اور موضوع کے تجربات	:	شمشاد حیدر زیدی
۴۔	اردو مرثیہ اور مرثیہ نگار	:	سید شبیہ الحسن
۵۔	اردو مرثیہ (تاریخ مرثیہ)	:	سفارش حسین رضوی

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اکائی 9 میؔر کی دیگر شعری اصناف کا جائزہ

ساخت

9.1 تمہید

9.2 اغراض ومقاصد

9.3 میؔر کی دیگر شعری اصناف کا جائزہ

9.3.1 سلام

9.3.2 واسوخت

9.3.3 شہر آشوب

9.3.4 رباعی

9.3.5 قطعہ

9.3.6 مخمس

9.3.7 مسدس

9.3.8 ترکیب بند

9.3.9 ماحصل

9.4 آپ نے کیا سیکھا؟

9.5 اپنا امتحان خود لیجیے

9.6 سوالوں کے جوابات

9.7 فرہنگ

9.8 کتب برائے مطالعہ

9.1 تمہید

عزیز طلبا! اس اکائی میں آپ:

- میؔر کے سلام، واسوخت اور شہر آشوب کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔
- میؔر کی رباعی نگاری اور قطعہ نگاری کے فکر وفن سے واقف ہوں گے۔
- میؔر کی مخمس، مسدس اور ترکیب بند وغیرہ کی خصوصیات سے روشناس ہوں گے۔
- میؔر کی دیگر شعری اصناف کی قدر قیمت جانیں گے۔
- زیر مطالعہ اصناف کے حوالے سے میؔر کے شعری اور فکری تنوع سے متعارف گے۔

9.2 اغراض ومقاصد

عزیز طلبا! گذشتہ اکائی میں آپ نے میر کی مرثیہ نگاری کا تفصیلی مطالعہ کر کے ان کے مرثیوں کے فکر وفن کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اب آپ زیرِ نظر اکائی میں یہ جانیں گے کہ انھوں نے اپنے وقت کی رائج تقریباً سبھی اصناف میں مشقِ سخن کیا ہے۔ غالباً کلاسیکی شعرا میں اصناف سخن کی کثرت کے معاملے میں ان کا مقابلہ کوئی نہ کر سکے۔ کلاسیکی شعرا کے یہاں کسی شاعر کے باکمال ہونے کے لیے سبھی مروجہ اصناف میں طبع آزمائی کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ میر کا ایک مشہور قول ہے کہ اس وقت شاعر صرف ڈھائی ہیں ایک تو میں خود، ایک مرزا رفیع سوداؔ اور آدھے خواجہ میر دردؔ۔ جب کسی نے ان سے میر سوز کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا" "خیر پونے تین سہی، لیکن شریفوں میں ہم نے ایسے تخلص نہیں سنے۔" میرؔ نے اتنی زیادہ اصناف شاعری کو کیوں برتا؟ اس کے پیچھے بنیادی مقصد خود کو بڑا شاعر تسلیم کرانا تھا لیکن یہ ادھوری سچائی ہے۔ میرؔ خود کو ہر صنف اور ہر رنگ میں ثابت کرنا چاہتے تھے اس وجہ سے انہوں نے اپنے وقت کی سبھی اصناف میں طبع آزمائی کی۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے مطابق "اصناف سے یہ شغف زندگی سے شغف کو ظاہر کرتا ہے۔ میرؔ نے بھرپور زندگی گزاری تھی، اور یہ تمام زندگی ان کی شاعری میں اتر آئی ہے۔ کیا عجب ہے اگر گوناگوں اصناف سے یہ اور انہماک بھی اسی کا استعارہ ہو۔" (شعر شور انگیز، ص 33) بہر کیف میر کی دیگر شعری اصناف مثلاً: سلام، واسوخت شہر آشوب، رباعی، قطعہ، مخمس، مسدس، ترکیب بند وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ اول الذکر تین اصناف کی شناخت موضوع سے ہوتی ہے اور باقی اصناف کی پہچان موضوع کے بجائے ہیئت سے قائم ہوتی ہے۔

9.3 میرؔ کی دیگر شعری اصناف کا جائزہ

9.3.1 سلام

سلام مرثیہ ہی کی ایک ذیلی قسم ہے، جس میں مرثیہ کے موضوعات غزل کی ہیئت میں بیان کیے جاتے ہیں۔ اس میں تسلسل بیان ضروری نہیں ہے۔ عام طور پر سلام میں منقبت کے مضامین بیان کیے جاتے ہیں۔ عاشورہ کی محفلوں میں ثواب کی نیت سے اس کو پیش کیا جاتا ہے۔ میرؔ و سودا سے پہلے سلام کو ادبی حیثیت نہیں حاصل تھی۔ اس وقت کے سلاموں میں عام طور پر ہر شعر میں سلام کی تکرار ہوتی تھی۔ میر نے اس روش عام سے ہٹ کر سلام لکھا ہے۔ وہ ابتدائی بند میں سلام کا ذکر کر کے بعد میں منقبت کے مضامین بیان کرتے ہیں۔ میر کے ایک سلام کے چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ کیجیے:

اے سبط مصطفیٰ کے تجھ کو سلام پہنچے　　اے جان مرتضیٰ کے تجھ کو سلام پہنچے
اے حکم کش قضا کے تجھ کو سلام پہنچے　　اے غمزدہ سدا کے تجھ کو سلام پہنچے

بابا شہ ولایت نانا کی خلق امت | دریا کنارے اترے سارے وہ بے مروت
تو تشنہ کام تنہا یہ رنج یہ مصیبت | اے مبتلا بلا کے تجھ کو سلام پہنچے
بیٹے بھتیجے بھائی یار و رفیق سارے | ساقی کوثر آگے کیا تشنہ لب سدھارے
پانی جو تونے مانگا سو تیر تجھ کو مارے | اے خستہ دل جفا کے تجھ کو سلام پہنچے
اللہ ری تیری عزت مرنا جو تونے ٹھانا | زنہار منھ نہ پھیرا گو پھر گیا زمانہ
آتا ہے کس سے ایسا بیکس ہو مارے جانا | اے دل زدہ رضا کے تجھ کو سلام پہنچے

احمد محفوظ کی تحقیق کے مطابق میرؔ کے مرثیوں کی تعداد ۳۴ اور سلام کی تعداد سات ہے۔

9.3.2 واسوخت

واسوخت دولفظوں کا مجموعہ ہے ''وا'' جس کے معنی کھلنا یا کھلا ہوا ہونا اور ''سوخت'' کے معنی جلنا یا جلانا ہے۔ واسوخت ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں شاعر محبوب کی بے التفاتی اور اس کے ظلم وستم سے تنگ آکر اس پر طنز کستا ہے اور جلی کٹی سناتا ہے۔ کئی دفعہ وہ کسی دیگر کے حسن و جمال کی تعریف کرتا ہے اور اس سے دل لگانے کی بات کرتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی حربہ ہوتا ہے جو عاشق اپنے معشوق کو راہ راست پر لانے کے لیے کرتا ہے۔ محمد حسین آزاد نے میر تقی میرؔ کو اس صنف کا بانی قرار دیا ہے۔ لیکن قاضی عبدالودود نے آبروؔ کو واسوخت کا موجد قرار دیا ہے۔ اگر ہم میرؔ کو اس صنف کا بانی نہ بھی مانیں تب بھی مرزا شفیق حسین شفق کے بقول ''واسوخت نگاری میں میرؔ کی حیثیت چراغ راہ کی ہے اور میرؔ کے واسوخت اردو میں باضابطہ فنی لحاظ سے واسوخت کی ابتدائی شکل ہیں۔'' میرؔ ہی وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اردو میں واسوخت کے عنوان سے نظمیں کہیں۔ اور اس کے لیے مسدس کی ہیئت اختیار کی۔ میرؔ کی کلیات میں کل چار واسوخت ہیں جن کے مطلعے درج ذیل ہیں:

۱۔ طرز اے رشک چمن اب تری کچھ تازی ہے

۲۔ سچ کہو شہر میں صحرا میں، کہاں رہتے ہو؟

۳۔ یاد ایام کہ خوبی سے خبر تجھ کو نہ تھی

۴۔ ایک دن وے تھے کہ تم کو نہ فریب آتے تھے

''طرز اے رشک چمن میں........'' کل ۲۷ بند ہیں۔ اس میں ابتدائی چار بندوں میں معشوق سے شکوہ وشکایت اور پانچ سے نو بندوں تک اس بات پر افسوس کرتے ہیں کہ انہوں نے اس سے تعلقات رکھا ہی کیوں؟ اس کے بعد دو بندوں میں اس کو اپنے احسانات یاد دلاتے ہوئے کہتے ہیں اگر میں نے تمھیں حسن کے آداب نہ سکھائے ہوتے تو مجھے یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ پھر معشوق کے غیروں سے التفات اور اپنے سے بے اعتنائی کا شکوہ کرتے ہیں۔ ایک بند ملاحظہ ہو:

وے جو آزردہ ہوں ٹک بھی تو منانے جاؤ　　مکث کر بیٹھ رہیں گھر تو بلانے جاؤ
الغرض کر کے ادھر سو سو بہانے جاؤ　　ان کو دریا پہ جو سن پاؤ نہانے جاؤ
ہم اگر خاک ملیں منہ پہ نہ بولو چالو
ہم اگر لوہو لگیں رونے تو ہنس کر ٹالو

اس کے بعد وہ انتقام کے طور بارہ بندوں میں ایک فرضی محبوب کے حسن اور وفا شعاری کا بیان کرتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ محبوب نفسیاتی طور پر ان کی طرف آنے پر مجبور ہو جائے۔ وہ کہتے ہیں:

اور مہ پارہ بھی اس شہر میں مشہور ہے اب　　اس کی محبوبی و خوبی ہی کا مذکور ہے اب
دیکھنا کچھ ہو اسی کا مجھے منظور ہے اب　　صَرف اسی پر کروں گا اپنا جو مقدور ہے اب
اوس کنے ضد سے تری شام وسحر جاؤں گا
گھر سے جس دم اٹھوں گا اس کے ہی گھر جاؤں گا

آخر میں آکر میرؔ تھوڑا نرم پڑ جاتے ہیں۔ وہ محبوب سے صلح کے خواہاں ہوتے ہیں اور اس کو یاد دلا دیتے ہیں مگر اس کو یہ بتانا نہیں بھولتے کہ اگر اس کو میرے کسی اور سے ملنے سے تکلیف ہوتی ہے تو ایسا ہی کچھ تمہارے کسی اور سے ملنے پر مجھے بھی محسوس ہوتا ہے:

اب بھی گر سمجھے تو مجھ کو ہے وہی تجھ سے پیار　　چھیڑا کا ننگ نہیں تری نہ گالی کا ہے عار
وہ مخلص ہوں قدیمی وہی میں تیرا یار　　بندگی کیش وفا شیوہ و اخلاص شعار
چوٹ مجھ کو بھی تو غیروں کی ملاقات سے ہے
چھوڑے یہ تو تو پھر آزردگی کس بات کی ہے

اس واسوخت کے سرسری مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ میر کے یہاں ڈرامائیت کی کمی نہیں ہے۔ وہ موضوع کے لحاظ سے آسان اور صاف ستھری زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ میں زبردست کاٹ ہوتی ہے۔ انہوں نے موقع ومحل کے اعتبار سے چست و درست مکالمے استعمال کیے ہیں۔ میر نے اس واسوخت میں کئی خوب صورت تراکیب کا استعمال کیا ہے۔ مثلا: روش غنچہ، روے حرف، روے گل رنگ، لعل جاں بخش، بندگی کیش، اور دست گستاخ وغیرہ۔ اگر تئیں اور کنے جیسے نامانوس اور متروک الفاظ کا استعمال کیا بھی ہے تو سیاق و سباق سے اس کا معنی واضح ہو جاتا ہے۔ محمد حسین آزاد واسوخت نگاری میں میرؔ کی عظمت کا اعتراف کرتے کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''سیکڑوں شاعروں نے واسوخت کہے لیکن خاص خاص محاوروں سے قطع نظر کرلیں تو آج تک اس کوچہ میں میرؔ صاحب کے خیالات و انداز کا جواب نہیں۔''

(آب حیات،ص:۱۹۹)

مرزا شفیق حسین شفق کے بقول:

''میرؔ نے اس کے قالب کو فارسی کی بے جا آمیزش سے پاک کیا اور ایک نئے طرز کی بنیاد رکھی جس کو دہلی اور لکھنؤ دونوں دبستانوں کے شعرا نے اختیار کیا۔''

(دیدنی ہوں جو سوچ کر دیکھو، مرتبہ ریشماں پروین، جلد دوم،ص:۶۵)

9.3.3 شہر آشوب

شہر آشوب ایسی صنف ہے، جس میں کسی ملک یا شہر کی تباہی و بربادی، بدنظمی اور انتشار کا بیان ہوتا ہے۔ اس کی کوئی مخصوص ہیئت نہیں ہوتی ہے۔ اردو شعرا نے عام طور پر مخمس، مسدس، قطعہ، رباعی، مثنوی اور قصیدے کی ہیئت میں شہر آشوب لکھے ہیں۔ اردو کے پہلے شہر آشوب نگار کے طور پر جعفر زٹلی کا نام لیا جاتا ہے۔ میرؔ کے کلام کا ایک بڑا حصہ موضوعاتی اعتبار سے شہر آشوب قرار دیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے دہلی کو اجڑتے اور ویران ہوتے دیکھا ہے۔ احمد شاہ اور عالمگیر ثانی کی دردناک موت کو دیکھا ہے۔ خود میرؔ کی اپنی زندگی مصائب اور مشکلات سے پر تھی۔ ان تمام چیزوں کا ان کی شاعری پر گہرا اثر پڑا۔ وہ جگہ جگہ دہلی کی تباہی و بربادی کو اپنی شاعری میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے یہاں دل اور دلی مترادف الفاظ ہیں۔ دلی کی تباہی اور ویرانی ایک علامت کے طور پر ان کی شاعری میں نظر آتی ہے:

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا
اس کے گئے پہ دل کی خرابی نہ پوچھیے جیسے کسو کا کوئی نگر ہو، لٹا ہوا
کیا کہوں کچھ بھی اس سے چھوٹا ہے ملک دل ان اس نے صاف لوٹا ہے

میرؔ کہتے ہیں کہ مرہٹوں اور ابدالیوں نے تم لوگوں کے ساتھ جو کیا ہے ویسا ہی کچھ میرے ساتھ میرے محبوب نے کیا ہے اور ایک جگہ وہ دلی کی تباہی کو بطور علامت استعمال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھو جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر گزرا
خرابی دل کی کیا انبوہ درد و غم سے پوچھو ہو وہی حالت ہے جیسے شہر لشکر لوٹ جاتا ہے
دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں تھا کل تلک دماغ جنہیں تخت و تاج کا

کیا کہیں میر جی ہم تم سے معاش اپنی غرض　　غم کو کھایا کریں ہیں لوہو پیا کرتے ہیں
تنگ آئے ہیں دل اس جی سے اٹھا بیٹھیں گے　　بھوکوں مرتے ہیں کچھ اب یار بھی کھا بیٹھیں گے

یہ وہ اشعار ہیں جو ان کی شاعری میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں جن میں دہلی کی تباہی و بربادی کا ذکر کہیں براہ راست ہے کہیں علامت اور استعارہ کی شکل میں کیا گیا ہے۔ انھوں نے تین شہر آشوب بھی لکھے ہیں جن میں دہلی کی سلطنت کے زوال اور اس کے نتیجے میں وہاں کے عوام اور اہل حرفت کی بدحالی کی حالت زار بڑے درد انگیز انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ تینوں شہر آشوب مخمس کی ہیئت میں ہیں۔ مخمس در ہجو لشکر کے چند بند ملاحظہ کیجیے:

جس کسو کو خدا کرے گمراہ　　آوے لشکر میں رکھ امید رفاہ
یاں نہ کوئی وزیر ہے نے شاہ　　جس کو دیکھو سو، سو ہے بہ حال تباہ
طرفہ مردم ہوئے ہیں اکٹھے آہ

فقر و فاقے کی ہر طرف ہے دھوم　　اور تلنگے جہاں ہیں واں ہے ہجوم
لشکر اک ہے خرابہ مردم بوم　　زندگی کرنے کی طرح معلوم
کر رہے جوں خدا ہی ہے آگاہ

فوج حکومت کا بنیادی ستون ہوا کرتی ہے۔ جس بادشاہ کی فوج کا یہ حال ہو کہ وہاں کوئی وزیر یا بادشاہ نہ ہو۔ جہاں فوجی فاقہ کشی پر مجبور ہوں تو وہاں جس کے ہاتھ جو لگے گا وہ اس کو ہڑپنے کی کوشش کرے گا۔ ایسی حالت میں زندگی کا گزارہ کیسے ہوتا ہے اس کے بارے میں میرؔ کہتے ہیں خدا ہی جان سکتا ہے۔ یہ معاملہ صرف فوج کا ہی نہیں ہے۔ فوج کی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر چور، اچکے اور بدمعاشوں نے لوگوں کا جینا مشکل کر دیا ہے۔ اسی شہر آشوب میں وہ کہتے ہیں:

جاؤ کرنے تلاش جس کے گھر　　پہنچنا اس تلک بہت دوبھر
راہ مطلق نہیں نکلتی ادھر　　باعث صد فساد و شور و شر
دس تلنگے ہیں در پہ بے گہہ و گاہ

''در حال لشکر'' میں کل انیس بند ہیں۔ اس مخمس شہر آشوب میں میرؔ نے اگرچہ ابتدا بادشاہ کے لشکر کی بدحالی سے کی ہے، لیکن اس میں عوام کی بدحالی کی بھی واضح تصویر کھینچی ہے۔ ابتدائی بند میں فوج میں شمولیت کی روداد بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

مشکل اپنی ہوئی جو بود و باش　　آئے لشکر میں ہم برائے تلاش
آن کے دیکھی یاں کی طرفہ معاش　　ہے لب ناں پہ جگہ پرخاش
نے دم آب ہے نہ چمچہ آش

عوام کی بدحالی کا نقشہ کھینچتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ جو لوگ پہلے جبہ دستار والے تھے وہ اب فقیر بن گئے ہیں۔ان کے بدن کی رگیں کمزوری کی وجہ سے لکیر کی مانند ابھر گئی ہیں۔پورے شہر میں ایسی معاشی تنگی ہے کہ اگر ایک ٹکڑا گوشت کہیں دیکھ لیں تو مکھیوں کہ طرح فقیر اس کو اچکنے کے لیے اس پر گر پڑیں، بند ملاحظہ کیجیے:

جبے والے جو تھے ہوئے ہیں فقیر　　　　تن سے ظاہر رگیں ہیں جیسے لکیر
ہیں معذب غرض صغیر و کبیر　　　　مکھیاں سی گریں ہزاروں فقیر
دیکھیں ٹکڑا اگر برابر ماش

میؔر کی صاف گوئی ہے کہ انہوں نے ملک وفوج کی بدحالی کے لیے رئیس وقت کی عیاشی کو ذمے دار ٹھہرایا ہے۔وہ کہتے ہیں:

لعل خیمہ جو ہے سپہر اساس　　　　پالیں ہیں رنڈیوں کی اس کے پاس
ہے زنا و شراب بے وسواس　　　　رعب کا کر لیجیے یہیں سے قیاس
قصہ کوتہ رئیس ہے عیاش

مذکورہ بالا اشعار کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کی فوج کے بارے میں اور خود بادشاہ کے بارے میں کھل کر لکھنے کا حوصلہ میر کے یہاں تھا۔انہوں نے فوج، عوام اور ساہوکاروں سب کی بدحالی کی روداد بغیر کسی خوف کے اپنے شہرآشوبوں میں بیان کر دی ہے۔

9.3.4 رباعی

رباعی چار مصرعوں کی ایسی نظم ہوتی ہے جس میں کسی خیال کو تسلسل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ظاہری شکل میں یہ غزل کی طرح ہوتی ہے۔جس میں پہلا دوسرا اور تیسرا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے۔رباعی کو غزل اور قطعہ سے الگ کرنے والی چیز اس کا مخصوص اوزان میں ہونا ہے۔اس کے لیے اہل فن نے بحر ہزج کے ۲۴ اوزان کو مخصوص قرار دیا ہے۔رباعی کے چاروں مصرعے ان مخصوص ۲۴ اوزان میں سے کسی بھی وزن پر ہو سکتے ہیں۔اس طرح ایک ہی رباعی چار مختلف اوزان میں ہوسکتی ہے۔اس شرط کے ساتھ کہ اگر تقطیع کی جائے تو اس کے کسی بھی مصرعے میں قابل شمار حروف کی تعداد بیس ہونے چاہیے۔اوزان کی بندش کی وجہ سے بظاہر آسان سی دکھنے والی صنف رباعی ایک مشکل صنف قرار دی جاتی ہے۔عموماً باکمال شعرا ہی اس میں مشق سخن کرتے ہیں۔مشکل ہونے کے باوجود یہ صنف ہر دور میں مقبول رہی ہے۔یوں تو رباعی کے لیے بحر ہزج کے ۲۴ ارکان مخصوص ہیں لیکن شمیم احمد کے مطابق میؔر نے زیادہ تر رباعیاں ''مفعول، مفاعلن، مفاعیلن، فع'' اور ''مفعولن مفاعیل، مفاعیلن، فع''، کے وزن پر کہیں ہیں۔(اصناف سخن اور شعری ہیئتیں، ص:۴۷)

میرؔ کی رباعیوں میں ان کی غزلوں کی طرح سوز و گداز پایا جاتا ہے۔ وہ سادہ اور مترنم الفاظ کے استعمال سے اپنی رباعیوں میں اثر انگیزی پیدا کرتے ہیں۔ بقول سلام سندیلوی ''وہ ہر رباعی میں اس جذبہ کو نظم کرتے ہیں جس کو وہ ذاتی طور پر محسوس کرتے ہیں اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر رباعی میں میرؔ کا دل دھڑک رہا ہے۔'' میرؔ کی رباعیوں میں گونا گوں دنیا آباد ہے۔ انہوں نے عشقیہ، سماجی، فلسفیانہ، متصوفانہ، اخلاقی اور مذہبی تقریباً ہر موضوع پر رباعیاں لکھی ہیں۔ ایک عشقیہ رباعی جس میں وہ بتاتے ہیں کہ ایک مصور محبوب کے حسن سے متاثر ہو کر اس کی تصویر بنانا چاہتا ہے، مگر یہ اس کی خام خیالی ہے محبوب کے حسن کو مصور کا قلم قید ہی نہیں کر سکتا ہے:

منہ دیکھو کہ شکل یار کھینچے گا اغلب ہے وہ غم کا بار کھینچے گا
نقاش بہت خمار کھینچے گا بیٹھا ہے بنانے اس کی چشم میگوں

میرؔ نے اپنی رباعیوں میں اپنے عہد کی بدحالی کو بیان کیا ہے۔ مغلیہ سلطنت کا زوال اور حملہ آوروں کی وجہ سے دہلی کی حالت مرد بیمار کی سی ہوگئی تھی۔ میر کی شاعری میں اس کا درد صاف نظر آتا ہے۔ میرؔ اپنی ایک رباعی میں لکھتے ہیں:

ہر کوچے میں سوجوان رعنا دیکھا ہر روز نیا ایک تماشہ دیکھا
ان آنکھوں سے ہم نے آہ کیا کیا دیکھا دلی تھی طلسمات کہ ہر جاگہ میرؔ

میرؔ سے پہلے بھی اردو شعرا نے رباعی لکھی ہیں، لیکن ان کی رباعیوں میں وہ اثر آفرینی نہیں ہے جو میرؔ کی رباعیوں میں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ میر اردو کے پہلے بڑے رباعی گو ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ ان کی رباعیوں کی تعداد احمد محفوظ کے مطابق (۱۰۵) ہے اگر ان میں مستزاد رباعیوں کو شامل کر لیا جائے تو یہ تعداد (۱۱۱) ہو جاتی ہے۔ (بیان میرؔ، ص:۶۱)

9.3.5 قطعہ

قطعہ ہیئت کے اعتبار سے غزل اور قصیدہ سے زیادہ نزدیک ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس میں مطلع کا ہونا ضروری نہیں۔ قطعہ کم سے کم دو مصرعے کا ہوتا ہے زیادہ کی کوئی قید نہیں ہے۔ قطعہ میں کسی موضوع یا بحر کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ اس کے تمام اشعار ہم وزن و قافیہ اور خیال میں تسلسل پایا جاتا ہے۔ غزل کی ہیئت میں ہونے کی وجہ سے بعض اوقات غزل کہتے ہوئے شاعر کسی ایک موضوع پر متوجہ ہو کر کئی اشعار کہہ دیتا ہے۔ انہیں الگ درج کرنے کے بجائے اسی غزل میں لکھ دیا جاتا ہے اس کو قطعہ بند کہتے ہیں۔ علامت کے لیے ''ق'' لکھ دیا جاتا ہے۔

میرؔ کے کلیات میں تین مستقل قطعات ملتے ہیں جو دو بیتی یعنی چار مصرعوں پر مشتمل ہیں۔ اس میں پہلا حضرت حسینؓ کی منقبت میں ہے۔ دوسرے اور تیسرے قطعات میں عشقیہ جذبات نگاری کی گئی ہے۔ ایک قطعہ بطور نمونہ ملاحظہ کیجیے:

جو اے قاصد وہ پوچھے میرؔ بھی ایدھر کو چلتا تھا　　تو کہیو جب چلا ہوں میں تب اس کا جی نکلتا تھا
سماں افسوس بے تابی سے تھا کل قتل میں میرے　　تڑپتا تھا اِدھر میں یار اُدھر ہاتھوں کو ملتا تھا

میرؔ کی کلیات میں قطعہ بند مثالیں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ انہوں نے قطعہ بند میں اشعار کی تعداد محدود نہیں رکھی ہے انہوں نے چودہ اور اٹھارہ مصرعوں پر مشتمل قطعات بھی لکھے ہیں۔ میرؔ کا مشہور قطعہ بند شعر دیکھیے :

کل پاؤں ایک کاسہ سر پر جو آ گیا　　یکسر وہ استخوان شکستہ سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر　　میں بھی کبھو کسو کا سرِ پر غرور تھا

میرؔ غزل کے شاعر ہیں اس وجہ سے ان کے قطعات میں اختصار و اطناب کی صفت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ انہوں نے دو اشعار میں اپنے کمال فن سے جو اثر آفرینی پیدا کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان کے قطعات اختصار، جامعیت، نشتریت اور برجستگی کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان کے قطعات میں تغزل کی کیفیت نمایاں ہے۔ زبان کی صفائی نے ان کے قطعات کی دلکشی کو دوبالا کر دیا ہے۔

9.3.6 مخمس

مخمس، مسدس، مسبع اور مثمن وغیرہ دراصل مسمط کی مختلف شکلیں ہیں۔ مسمط دراصل ایسی نظم کو کہتے ہیں جو ہیئت کے لحاظ سے مختلف بندوں پر مشتمل ہو۔ بندوں میں اشعار کی تعداد مقرر نہیں ہے لیکن پہلے بند میں اشعار کی جو تعداد مقرر کر دی جاتی ہے وہی تمام بندوں میں برقرار رکھی جاتی ہے۔ ان اقسام میں شعرا نے مخمس اور مسدس کو سب سے زیادہ برتا ہے۔ مخمس اس نظم کو کہتے ہیں جس کے ہر بند میں پانچ مصرعے ہوں۔ اس کے ہیئتی نظام میں کافی وسعت ہے۔ عام طور پر نظم کے پہلے پانچ بند ایک ہی قافیہ پر ہوتے ہیں۔ اس کے بعد کے بندوں میں صرف پانچویں بند میں پہلے قافیہ کی تکرار ہوتی ہے۔ میر نے زیادہ تر مخمس اسی ہیئت میں لکھے ہیں۔ مخمس کی اس شکل میں میر کے دو بند ملاحظہ کیجیے:

یہ بات جھوٹ نہیں صدق کی صفا کی قسم　　ترے ہی لطف کا وابستہ ہوں وفا کی قسم
عبث جو قسمیں ہے دیوے تو مصطفیٰ کی قسم　　جناب پاک بتول و شہ ولا کی قسم
قسم حسن کی حسین ابن مرتضیٰ کی قسم

تر ہوں خوار تری شان کی مجھے سوگند　　مروں ہوں تجھ پہ تری جان کی مجھے سوگند
تجھی جو جپتا ہوں ایمان کی مجھے سوگند　　یہ وظیفہ ہے قرآن کی مجھے سوگند
تجھی سے بندگی رکھتا ہوں میں خدا کی قسم

اس نظم میں پہلے بند کے سبھی اشعار میں قافیہ کی تکرار ہے۔ اس کے بعد والے بند کے چار مصرعوں میں دوسرا قافیہ اختیار کیا گیا ہے۔ پھر پانچویں مصرع میں پہلے بند کے پانچویں مصرعہ کی تکرار ہے۔ اسی طرح پوری نظم میں قافیہ

کے نظام کی پیروی کی گئی ہے۔ عام طور سے مخمس کی یہی شکل رائج تھی جس کی پیروی میرؔ نے بھی کی۔

مخمس کی دوسری شکل یہ ہے ہر بند کا پانچواں مصرعہ ایک ہی ہو۔ اس کو ''مصرع ترجیع'' کہا جاتا ہے۔ میر نے مصرع ترجیع کے ساتھ کئی مخمس کہے ہیں۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

منقبت خوانی سے میرؔ سب ہیں سُن   اس سوا مجھ میں نہیں ہے کوئی گُن
ساتھ سر کے ہے علی گوئی کی دھن   مدعی اس کان یا اُس کان سُن
حیدری ہوں حیدری ہوں حیدری
شوق کامل سے تعجب ہے یہ کیا   جو بدن ہو خاک سب بعد فنا
اس سے نے آگے سبزے کی جا   برگ برگ اس کا کرے پھر یہ صدا
حیدری ہوں حیدری ہوں حیدری

مذکورہ بالا مخمس میں میرؔ نے مخمس کی ہیئت کو ہر طرح کے مضامین کے لیے استعمال کیا ہے لیکن زیادہ تر مخمس اہل بیت کی منقبت میں ہیں۔ اس کے علاوہ شہر آشوب اور ہجو کے لیے بھی انہوں نے مخمس کو اختیار کیا ہے۔

9.3.7 مسدس

مسدس سب سے مقبول ہیئت ہے۔ اس کو کربلائی مرثیوں کے لیے سب سے زیادہ استعمال کیا گیا ہے۔ اردو میں مسدس کی دو قسمیں مقبول ہیں۔ پہلی قسم جس میں پہلے کے چار مصرعے کسی ایک ہی نوع کے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور دو مصرعے کسی الگ نوع کے ہم قافیہ ہوں۔ مسدس کی یہ شکل خالص اردو کی ہے۔ اس کو ترکیب بند مسدس کا نام دیا جاتا ہے۔ میر کے ایک ترکیب بند مسدس کا پہلا بند دیکھیے:

چیدہ خواروں میں شہ روم ترے صبح و شام   ریزہ چینی سے تری بادشہ چیں کا قیام
حبشی ہندی صفا ہانی بخارائی تمام   ہیں ترے دست نگر لیجیے کس کس کا نام
یا علی کیست کہ شرمندہ احسان تو نیست
برسر خان کرم کیست کہ مہمان تو نیست

میرؔ نے مسدس کی دوسری شکل وہ اختیار کی ہے جس میں پہلے بند کے سبھی اشعار ہم قافیہ ہوتے ہیں اور پھر بعد کے سبھی بندوں میں پہلے بند کے آخری شعر کے قافیہ کی تکرار ہوتی ہے۔ چوں کہ میرؔ نے اپنے مسدس میں بند کے آخری شعر کی تکرار کی ہے اس لیے ان کے یہاں مسدس ترجیع بند ہیں۔ مسدس کی یہ شکل وہی ہے جو اصل عربی اور فارسی سے اردو میں آئی ہے۔ اس کی مثال میر کے یہاں ملاحظہ کیجیے:

درویش جو ہیں مقصد دل خواہ کہیں ہیں   سالک جو ہیں وے راہبر راہ کہیں ہیں

ان واقف اسرار دل آگاہ ہیں ہیں ایک چرخ حقیقت کا تجھے ماہ کہیں ہیں
کیا مدح ہے یہ جو تجھے ہم شاہ کہیں ہے
سچے ہیں وہی لوگ جو اللہ کہیں ہیں

میؔر نے مسدس کی ہیئت کو زیادہ تر منقبت اہل بیت اور نعت پاک کے لیے استعمال کی ہے۔

9.3.8 ترکیب بند

ہیئت کے اعتبار سے یہ صنف غزل کی مانند ہوتی ہے۔اس میں غزل ہی کی طرح قافیہ کی پابندی کی جاتی ہے۔ شروع کے چند اشعار غزل کی طرح ہوتے ہیں جو شمیم احمد کے مطابق کم سے کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ گیارہ ہوتے ہیں۔اس کے بعد بند کا آخری شعر اسی بحر میں الگ قافیہ کا ہوتا ہے۔اسی طرح باقی بند ہوتے ہیں۔ بندوں کی تعداد کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔

میر تقی میؔر نے ترکیب بند میں بھی مشق سخن کیا ہے۔انہوں نے اس صنف میں بھی نئے نئے تجربے کیے ہیں۔ایک ترکیب بند میں انہوں نے ہر بند کے آخری شعر کو فارسی میں اور باقی اشعار اردو میں لکھے ہیں۔ترکیب بند میں انہوں نے خود کو کسی خاص مضمون کے ساتھ باندھ کر نہیں رکھا۔دنیا کی بے ثباتی، عشق و محبت، پند و نصائح سبھی کچھ انہوں نے اس صنف میں نظم کیا ہے۔ایک بند بطور مثال ملاحظہ کیجیے:

اب کنارے وے تو جو ہیں گے زمیں کے زیریاں خاک پر بسمل پڑے ہیں کیسے کیسے شیریاں
دو قدم پر ہے یہ ہنگامہ ترے کوچے کے بیچ آشتابی کچھ نہیں لگنے کی تجھ کو دیریاں
منہ پہ کھانے والے تلواروں کے بھوکے موت کے سیکڑوں یک جا ہیں وے جینے سے تھے جو سیریاں
غم زدے بے خانماں بے وارثے بے کس غریب زخموں کے دامن کے منہ پر ہو رہے ہیں ڈھیریاں
گر تو ہم آئی پے طوف شہیداں دور نیست
گریہ می آید دریں جا راہ چنداں دور نیست

ان اشعار میں میؔر نے بہت سیدھے سادھے انداز میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچا ہے۔میؔر کسی بھی صنف میں شعر کہتے ہیں اس میں اپنی چھاپ چھوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کے ترکیب بند اشعار میں بھی زبان کی صفائی اور معانی و مفاہیم کا ایک جہان آباد ہے۔

مذکورہ بالا اصناف کے علاوہ میؔر نے شکارنامہ، تضمین، ہجویات، ساقی نامہ، اور شکارنامہ بھی لکھے ہیں لیکن اکثر محققین نے چوں کہ ان کو الگ صنف نہیں تسلیم کیا ہے اس وجہ سے ان کا ذکر نہیں کیا جا رہا ہے۔

9.3.9 ماحصل

میر تقی میرؔ اردو کے ایسے باکمال شاعر ہیں جن کی تخلیقی کائنات بہت وسیع ہے۔ وہ نظم اور نثر دونوں کو اپنے اظہار کا وسیلہ بناتے ہیں۔ شاعری میں انہوں نے خود کو صرف غزل، قصیدہ اور مثنوی تک محدود نہیں رکھا۔ اس وقت کی سبھی مروجہ اصناف میں انہوں نے صرف یہ کہ طبع آزمائی کی بلکہ ہر ایک صنف میں اپنی چھاپ چھوڑنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ انہوں نے غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، سلام، رباعی، مخمس، مسدس، واسوخت، ترکیب بند، تضمین، ہجویات، اور قطعہ جیسی اصناف میں طبع آزمائی کی۔ اصناف سخن کی کثرت کے معاملہ میں شاید ہی کوئی شاعر ان کا مقابلہ کر سکے۔ صنف رباعی اگرچہ ان سے پہلے بھی رائج تھی۔ کئی شعرا نے ان سے پہلے بھی رباعیاں کہیں تھیں لیکن اس صنف کو پختگی اور خاص پہچان دینے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ بعض محققین میرؔ کو واسوخت کا موجد قرار دیتے ہیں۔ میرؔ ایک بحر کے موجد بھی قرار دیے جاتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے مطابق اتنی زیادہ اصناف کو برتنے کی وجہ یہ ہے کہ میر خود کو ہر رنگ میں ثابت کرنا چاہتے تھے۔ میرؔ نے جس صنف کو بھی اختیار کیا اس میں جان ڈالنے کی کوشش کی۔

9.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- میرؔ کی قادر الکلامی اور مختلف شعری اصناف کے تجربات سے واقفیت حاصل کی۔
- میرؔ کے مختلف النوع شعری اصناف کے موضوعات و مضامین کی معلومات حاصل کی۔
- زیر بحث شعری اصناف کی تعریف اور اس کے اقسام کی جانکاری حاصل کی۔
- مختلف شعری اصناف کی روشنی میں میرؔ کے کلام کی انفرادیت اور امتیازات جانا۔
- مختلف شعری اصناف کی روشنی میں میرؔ کی عظمت کو سمجھا۔

9.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ میرؔ کی رباعیوں کی چند اہم خصوصیات بیان کیجیے۔

۲۔ واسوخت کس کو کہتے ہیں؟ بیان کیجیے۔

۳۔ رباعی کس بحر میں لکھی جاتی ہے اور اس کے کتنے اوزان مقرر ہیں؟ واضح کیجیے۔

۴۔ ترکیب بند کسے کہتے ہیں؟ بیان کیجیے۔

۵۔ قطعہ کے متعلق اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

9.6 سوالوں کے جوابات

۱۔ میرؔ کی رباعیوں میں ان کی غزلوں کی طرح سوز و گداز پایا جاتا ہے۔ وہ سادہ اور مترنم الفاظ کے استعمال سے اپنی رباعیوں میں اثر انگیزی پیدا کرتے ہیں۔ بقول سلام سندیلوی ''وہ ہر رباعی میں اس جذبہ کو نظم کرتے ہیں جس کو وہ ذاتی طور پر محسوس کرتے ہیں اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر رباعی میں میر کا دل دھڑک رہا ہے۔''

۲۔ واسوخت دو لفظوں کا مجموعہ ہے ''وا'' جس کے معنی کھلنا یا کھلا ہوا ہونا اور ''سوخت'' کے معنی جلنا یا جلانا ہے۔ واسوخت ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں شاعر محبوب کی بے التفاتی اور اس کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر اس پر طنز کستا ہے اور جلی کٹی سناتا ہے۔ کئی دفعہ وہ کسی دیگر کے حسن و جمال کی تعریف کرتا ہے اور اس سے دل لگانے کی بات کرتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی حربہ ہوتا ہے جو عاشق اپنے معشوق کو راہ راست پر لانے کے لیے کرتا ہے۔

۳۔ رباعی بحر ہزج کے ۲۴ اوزان میں سے کسی ایک وزن میں لکھی جاتی ہے۔ رباعی کے چاروں مصرعوں میں ان ۲۴ اوزان میں سے الگ الگ وزن بھی استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

۴۔ ہیئت کے اعتبار سے ترکیب بند غزل کی مانند ہوتی ہے۔ اس میں غزل ہی کی طرح قافیہ کی پابندی کی جاتی ہے۔ شروع کے چند اشعار غزل کی طرح ہوتے ہیں جو شمیم احمد کے مطابق کم سے کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ گیارہ ہوتے ہیں۔ اس کے بعد بند کا آخری شعر اسی بحر میں الگ قافیہ کا ہوتا ہے۔ اسی طرح باقی بند ہوتے ہیں۔ بندوں کی تعداد کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔

۵۔ قطعہ ہیئت کے اعتبار سے غزل اور قصیدہ سے زیادہ نزدیک ہے۔ فرق یہ ہے یہ کہ اس میں مطلع کا ہونا ضروری نہیں۔ قطعہ کم سے کم دو مصرعے کا ہوتا ہے زیادہ کی کوئی قید نہیں ہے۔ قطعہ میں کسی موضوع یا بحر کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ اس کے تمام اشعار ہم وزن و قافیہ اور خیال میں تسلسل پایا جاتا ہے۔ غزل کی ہیئت میں ہونے کی وجہ سے بعض اوقات غزل کہتے ہوئے شاعر کسی ایک موضوع پر متوجہ ہو کر کئی اشعار کہہ دیتا ہے۔ انہیں الگ درج کرنے بجائے اسی غزل میں لکھ دیا جاتا ہے اس کو قطعہ بند کہتے ہیں۔ علامت کے لیے ''ق'' لکھ دیا جاتا ہے۔

9.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
سبط	:	نواسہ، اولاد، خاندان

تشنہ	:	پیاسا
زنہار	:	پناہ، حفاظت، بچاؤ، کسی کام سے باز رکھنے کے لیے بھی بولا جاتا ہے
بیکس	:	بے بس، مجبور
عبث	:	بے کار
مکث	:	توقف، تاخیر
لوہو	:	لہو، خون
کنے	:	پاس، نزدیک (عہد میر میں لفظ 'کس نے' کی جگہ لفظ 'کنے' بولا جاتا تھا۔)
کیش	:	خصلت
انبوہ	:	ہجوم، مجمع
بوم	:	الو

9.8 کتب برائے مطالعہ

۱۔ کلیاتِ میرؔ : عبارت بریلوی

۲۔ اصناف سخن اور شعری ہیئتیں : شمیم احمد

۳۔ میر تقی میرؔ: حیات اور شاعری : خواجہ احمد فاروقی

۴۔ اردو رباعیات : سلام سندیلوی

۵۔ دیدنی ہوں جو سوچ کر دیکھو : ریشماں پروین

اکائی 10 ''نکات الشعرا'' کا تنقیدی مطالعہ

ساخت

10.1 اغراض ومقاصد

10.2 تمہید

10.3 ''نکات الشعرا'' کا تنقیدی مطالعہ

10.3.1 تذکرہ نگاری: مفہوم اور محرکات

10.3.2 ''نکات الشعرا'' کا جائزہ

10.3.3 ماحصل

10.4 آپ نے کیا سیکھا؟

10.5 اپنا امتحان خود لیجیے

10.6 سوالوں کے جواب

10.7 فرہنگ

10.8 کتب برائے مطالعہ

10.1 اغراض ومقاصد

عزیز طلبا! اس اکائی میں آپ:

- تذکرہ کے لغوی اور اصطلاحی معنی سے واقف ہوں گے۔
- تذکرہ نگاری کے بنیادی محرکات کو جانیں گے۔
- میر تقی میرؔ کی تذکرہ نگاری کی اہم خصوصیات سے متعارف ہوں گے۔
- میر تقی میرؔ کی تنقیدی بصیرت کو سمجھیں گے۔
- ''نکات الشعرا'' کی اہمیت وافادیت سے روشناس ہوں گے۔

10.2 تمہید

عزیز طلبا! گذشتہ اکائی میں آپ نے میر کی دیگر شعری اصناف کا مطالعہ کیا اور یہ جانا کہ میر نے غزل کے علاوہ بھی اس دور کی مروجہ بیشتر شعری اصناف میں طبع آزمائی کر کے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔ کیا آپ جانتے ہیں؟ کہ میرؔ نے شاعری کے علاوہ نثر میں بھی کتابیں تحریر کی ہیں۔ جی ہاں! انہوں نے نثر میں تین کتابیں تحریر کی ہیں جن کے نام نکات الشعرا، ذکر میر اور فیض میر ہیں۔ ان میں جو شہرت اور مقبولیت نکات الشعرا کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کتاب کے حصے میں نہیں آئی۔ نکات الشعرا کو محققین نے اردو شعرا کا پہلا تذکرہ قرار دیا

ہے۔ یہ ان کی جوانی کے زمانے کی تصنیف ہے۔ اس میں میر نے اپنے معاصرین اور متقدمین اردو شعرا کے مختصر احوال، کلام کا انتخاب، شاعری پر تنقیدی آرا، بعض جگہ اشعار پر اصلاح کا کام بھی کیا ہے اور آخر میں اصول شعر بھی بیان کیے ہیں۔ لہذا آپ زیر نظر اکائی میں میر کی اسی اہم نثری تصنیف ''نکات الشعرا'' کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

10.3 ''نکات الشعرا'' کا تنقیدی مطالعہ

10.3.1 تذکرہ نگاری: مفہوم اور محرکات

تذکرہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی یادداشت یا دستاویز کے ہیں۔ تذکروں میں بنیادی طور پر تین چیزیں شامل ہوتی ہیں، شاعر کے مختصر حالات، اس کے کلام پر مختصر رائے یا تبصرہ اور آخر میں اس کے کلام کا انتخاب شامل کیا جاتا ہے جس میں عموماً غزلوں کو جگہ دی جاتی ہے۔ اردو میں تذکرہ نگاری فارسی سے آئی۔ اردو میں لکھے گئے ابتدائی تذکروں میں نہ صرف یہ کہ فارسی تذکروں کی پیروی کی گئی بلکہ اس زمانے کی علمی زبان ہونے کی وجہ سے عموماً ان کو فارسی میں لکھا بھی گیا۔ فرمان فتحپوری کے مطابق نورالدین محمد عوفی کا 'لباب الالباب' فارسی کا پہلا تذکرہ ہے جو ۶۱۷ تا ۶۱۸ ہجری کے درمیان لکھا گیا ہے۔ تذکرے اگرچہ مروجہ تنقیدی معیار پر پورے نہیں اترتے، لیکن ان میں تنقید کے ابتدائی نقوش کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ انھی تذکروں کی بدولت بہت سے شعرا گوشۂ گمنامی میں جانے سے بچ گئے۔ تذکروں کی اہمیت کی وجہ سے ناقدین کا خیال ہے کہ اس کے مطالعہ کے بغیر اپنی ادبی روایت کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکتا۔

تذکروں کے وجود میں آنے کی بنیادی وجہ اپنے پسندیدہ شعرا کی تعریف و توصیف کر کے ان کے قدر میں اضافہ کرنا اور بعض دفعہ مخالفین کی تنقیص کر کے ان کے مرتبہ کو کم کرنا ہے۔ میر نے نکات الشعرا کے مقدمہ میں کتاب کی وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: ''آج تک کوئی ایسی کتاب تصنیف نہیں ہوئی جس سے اس فن کے شاعروں کا حال صفحۂ روزگار پر باقی رہے اس لیے یہ تذکرہ جس کا نام نکات الشعرا ہے لکھا جا رہا ہے۔'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تذکرہ کے لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ اردو کے شاعروں کے احوال اور ان کی شاعری کے نمونے اس کتاب میں جمع کر دیے جائیں تا کہ ان کے کارنامے آئندہ کے لیے باقی رہیں۔ یہ تذکرہ نگاری کے بنیادی محرکات میں سے ایک ہے جس کے تحت تذکرے لکھے گئے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی تذکرہ نگاری کے پیچھے کارفرما جن محرکات کو زیر بحث لائے ہیں، ان میں بقائے نام کی آرزو، ارباب کمال کی قدر شناسی، ادبی و تحقیقی ذوق کی تسکین، تاریخی شعور، رقابت اور معاصرانہ چشمکیں، ادبی گروہ بندی، احباب و اعزہ کی فرمائشیں، سرپرستوں کی خوشنودی، مشاعروں کی گرم بازاری، اور پسندیدہ کلام کو باقاعدہ نظم و ترتیب کے ساتھ جمع کرنے کا شوق شامل ہیں۔ ڈاکٹر محمد یعقوب عامر تذکرہ نگاری کے فروغ میں دو نمایاں عوامل کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اُردو میں تذکرہ نگاری کا کام اگرچہ علمی اور تحقیقی کام تھا مگر اس کو فروغ دینے میں دو چیزیں نمایاں طور پر کارفرما نظر آتی ہیں۔(۱) کچھ لوگوں نے علاقائی تعصب، گروہ بندی اور معاصرانہ چشمک کے زیراثر تذکروں کی تصنیف وتالیف کر کے اپنے حریفوں کو قصداً غیراہم اور ہیچ و پوچ ثابت کرنے کی کوشش کی۔(۲) کچھ لوگوں کی تحریر کا مقصد یہ رہا کہ وہ اپنے استاد اور ان کے دوستوں یا اپنے استاد بھائیوں یا دوست شاعروں کو منظر عام پر لائیں اور اس مقصد کے لیے انھوں نے ان کی حمایت اور طرف داری میں بے جا مبالغوں سے کام لیا۔ چنانچہ ہر دو صورت میں کسی نہ کسی شاعر کے ساتھ ناانصافی ضرور ہوتی تھی اور اس ناانصافی کے خلاف ایک نیا تذکرہ وجود میں آتا تھا، جس کے ذریعہ مذمت اور احتجاج کیا جاتا۔ میر کے نکات الشعرا سے لے کر آب حیات تک بلکہ اس کے بعد کے تذکروں میں بھی کہیں تیز اور کہیں خفیف یہ جذبہ موجود رہا ہے۔''

(ڈاکٹر محمد یعقوب عامر، اُردو کے ابتدائی ادبی معرکے، ۱۹۹۱ء، ص:۲۲)

نکات الشعرا کے بارے میں یہ کہنا کہ انہوں نے یہ تذکرہ معاصرانہ چشمک کی وجہ سے اپنے مخالف گروہ کے شعرا کو کمتر دکھانے کے لیے لکھا ان کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔ کچھ شعرا کے ساتھ انہوں نے واقعی انصاف سے کام نہیں لیا لیکن اس کی بنیاد پر پوری کتاب پر سوالیہ نشان قائم کرنا ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔

10.3.2 ''نکات الشعرا'' کا جائزہ

میر تقی میرؔ نے نکات الشعرا کے مقدمہ میں اس کو اردو شاعروں کا پہلا تذکرہ قرار دیا ہے۔ مولوی عبدالحق، محمود الٰہی، فرمان فتحپوری اور دوسرے محققین نے میر کے اس دعوے کی تائید کی ہے۔ میر نے ''نکات الشعرا'' کے سال تصنیف کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے، لیکن داخلی شواہد کی بنیاد پر محققین نے ۱۱۵٦ ہجری کو اس کا سال تکمیل قرار دیا ہے۔ میر نے اپنے تذکرہ کے ابتدائی صفحات میں رائے آنند رام مخلصؔ کے بارے میں لکھا ہے:

''از مدت آزار نفث الدم داشت۔قریب یکسال ست کہ درگذشت''

(نکات الشعرا، مرتبہ محمود الٰہی، ص:۲۹)

(ترجمہ: انہیں ایک مدت سے نفث الدم (ایسی بیماری جس میں منہ سے خون آتا ہے۔ کا عارضہ تھا۔ تقریباً ایک سال پہلے ان کا انتقال ہوگیا۔)

لچھمی نرائن شفیق نے مخلصؔ کا سال وفات ۱۱٦۴ھ بیان کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر نے مخلصؔ کے کا تذکرہ ۱۱٦۵ھ/۵۲-۱۷۵۱ء میں لکھا ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ میر نے سید عبدالولی عزلتؔ کو 'تازہ واردان

ہندوستان‘ قرار دیا ہے۔ انہوں نے مختلف شاعروں کا تعارف کراتے وقت ان کی بیاض اور زبانی گفتگو کا بھی حوالہ دیا ہے۔ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی نے عزلتؔ کے دہلی آنے کی تاریخ ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۴ھ بہ مطابق ۵ اپریل ۱۷۵۱ء قرار دیا ہے۔ اس بنیاد پر حنیف نقوی کا کہنا ہے کہ سبھی دکنی شعرا کے حالات میر نے یقینی طور پر اس کے بعد لکھا ہوگا۔ ایک اور دلیل یہ ہے کہ میر نے بیدلؔ، گرامیؔ اور مخلصؔ کے حالات بیان کرتے وقت خان آرزو کے تذکرہ ’مجمع النفائس‘ کا ذکر کیا ہے۔ ’مجمع النفائس‘ کا سال تکمیل ۱۱۶۴ھ/ ۱۷۵۱ء ہے۔

مذکورہ بالا داخلی شواہد کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ میر نے یہ تذکرہ ۱۱۶۵ھ میں مکمل کیا۔ چوں کہ اس وقت تک کوئی تذکرہ منظر عام پر نہیں آیا تھا اس وجہ سے میر اپنے اس دعوی میں حق بجانب معلوم ہوتے ہیں۔ فرمان فتحپوری نے اردو کے قدیم ترین تذکروں کی ترتیب اس طرح بیان کی ہے:

نکات الشعرا، از میر تقی میر، سال تکمیل ۱۱۶۵ ہجری مطابق ۱۷۵۲ء

گلشن گفتار، از حمید اورنگ آبادی، سال تکمیل ۱۱۶۵ ہجری مطابق ۱۷۵۲ء

تحفۃ الشعرا، از افضل بیگ قاقشال، سال تکمیل ۱۱۶۵ھ مطابق ۱۷۵۲ء

ریختہ گویاں، از فتح علی حسینی گردیزی، تکمیل ۵ محرم ۱۱۶۶ھ مطابق ۱۱ نومبر ۱۷۵۲ء

مخزن نکات، از قیام الدین قائم، سال تکمیل ۱۱۶۸ھ مطابق ۱۷۵۵ء

(اردو شعرا کے تذکرے، فرمان فتح پوری، ص: ۲۵)

مذکورہ بالا تذکروں پر ایک تفصیلی بحث کے بعد فرمان فتح پوری بھی نکات الشعرا کی اولیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ قائم نے اگر چہ میر کی طرح اولیت کا دعوی کیا ہے لیکن ’مخزن نکات‘ سے ۱۱۶۸ھ کا سال برآمد ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کو میر کے تذکرہ پر تقدیم کا شرف نہیں دیا جا سکتا۔ مولانا امتیاز علی عرشی کے مطابق میر تقی میرؔ نے ۱۱۶۱ھ کے آس پاس ’نکات الشعرا‘ کو لکھنا شروع کیا تھا۔ گردیزیؔ نے اپنے تذکرہ کا آغاز ۱۱۶۵ھ کے آس پاس کیا اور قائم نے ۱۱۵۷ھ کے آس پاس ’مخزن نکات‘ لکھنا شروع کیا۔ اس طرح اگر تذکرہ لکھنے کی ابتدا کا خیال کیا جائے تو سب سے پہلے گردیزیؔ پھر قائمؔ اور تیسرے نمبر پر میر تقی میرؔ کا نام آتا ہے۔ لیکن اولیت کا اعتبار چوں کہ سال تکمیل کے اعتبار سے ہوتا ہے اس وجہ سے میرؔ کے تذکرہ ’نکات الشعرا‘ ہی کو مقدم مانا جائے گا۔

نکات الشعرا کی پہلی اشاعت انجمن ترقی اردو کی طرف سے ۱۹۲۲ء میں مولوی حبیب الرحمٰن شیروانی کے مقدمہ کے ساتھ ہوئی۔ بعد میں ۱۹۳۵ء میں انجمن ترقی اردو نے مولوی عبدالحق کے مقدمہ کے ساتھ اس کو دوبارہ شائع کیا۔ اس کی تیسری اشاعت ۱۹۷۲ء میں پروفیسر محمود الٰہی کے مقدمہ کے ساتھ ہوئی۔ ان کے پاس پیرس کا ایک قلمی نسخہ تھا، جس کی کتابت ۱۱۷۸ ہجری میں سورت میں ہوئی تھی۔ محمود الٰہی نے دوران متن اس نسخے سے بھی استفادہ کیا ہے۔

نکات الشعرا میں میر نے کل ایک سو تین شاعروں کا ذکر کیا ہے جن میں ایک وہ خود بھی ہیں۔ آب حیات میں محمد حسین آزاد نے میر کی طرف جو قول منسوب کیا ہے کہ 'میں اس کتاب میں ایک ہزار شعرا کا حال لکھوں گا' قرین قیاس نہیں اس لیے اس کتاب کی تصنیف کے زمانے تک اردو کے ایک ہزار شعرا کا وجود ممکن نہیں ہے۔ حنیف نقوی کا خیال ہے کہ نکات الشعرا کا کوئی نسخہ ایسا بھی ہوگا جس میں شاعروں کی تعداد اس سے زیادہ رہی ہوگی اس لیے کہ کئی قابل ذکر تذکرہ نگاروں نے نکات الشعرا کے حوالے سے ایسے شعرا کے احوال درج کیے ہیں جن کا ذکر موجودہ متن میں موجود نہیں ہے۔

شعرا کے احوال درج کرتے وقت میر نے نہ زمانی ترتیب کی رعایت کی ہے نہ حروف تہجی کا اعتبار کیا ہے۔ کتاب کے درمیان میں ایک مختصر سی تمہید کے بعد شعرائے دکن کا ذکر شروع ہوتا ہے اور اس کے فوراً بعد پھر شمال کے شعرا کے احوال کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ شعرائے دکن سے میرؔ کی واقفیت عبدالولی عزلتؔ کے بیاض کے توسط سے ہوتی ہے۔ عزلت ۱۱۶۴ھ میں دہلی آئے تھے۔ میرؔ کے ہاتھ جب عزلتؔ کی بیاض لگی تو انہوں نے اپنے تذکرہ میں شعرائے دکن کو شامل کر لیا۔ میرؔ نکات الشعرا کے مقدمہ میں اگرچہ ریختہ کا تعلق دکن سے بتاتے ہیں لیکن دکن کے شعرا کے بارے میں کسی اچھی رائے کا اظہار نہیں کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں دکن میں کوئی مربوط شاعر نہیں اٹھا۔ ان میں سے اکثر کا احوال میر کو ملول کرتا ہے۔ اس وجہ سے انہوں نے صرف چند دکنی شعرا کو ہی کتاب میں شامل کرنے کی بات کہی ہے۔ اگر میر کو عزلتؔ کی بیاض نہ ملی ہوتی تو دکن کے چند ایک شاعروں کو ہی کتاب میں جگہ ملتی۔

میر نے نکات الشعرا کی ابتدا امیر خسرو سے کی ہے۔ ان کا تذکرہ وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''مجمع کمالات و صاحب حالات و فضائل او اظہر من الشمّس است۔ احوال امیر مذکور در تذکرہ ہا مسطور، نوشتن ایں احقر العباد فضولیست۔ اشعار ریختہ آں بزرگ بسیار دارد۔ دریں خود تر ددے نیست۔ از انجملہ یک قطعہ تیمناً نوشتہ آید۔''

(ترجمہ: آپ کی ذات مجموعہ کمالات اور زندگی گونا گوں واقعات سے پر ہے۔ ان کے فضائل سورج کی طرح روشن ہیں۔ امیر مذکور کے حالات زندگی جا بجا تذکروں میں لکھے ہوئے ہیں اس لیے اس احقر العباد کا لکھنا فضول ہے۔)

امیر خسرو کے احوال صرف اس لیے بیان نہ کرنا کہ دوسری کتابوں میں ان کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے میر کی اس روش کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ اس کتاب کو بہت ضخیم نہیں بنانا چاہتے تھے۔ شعرا کے احوال بیان کرتے وقت ان کا عام رویہ یہی رہا ہے۔ میر نے سولہ شعرا کے تذکرے میں قدرے تفصیل سے کام لیا ہے جہاں انہوں نے ایک صفحہ یا اس سے کچھ زائد لکھا ہے۔ میر نے تقریباً ۳۰ شعرا کو صرف نام اور تخلص بیان کر کے نمونے کے اشعار درج کر دیے ہیں۔ اس کا نقصان یہ ہوا ہے کہ کتاب میں اکثر شاعروں کے ضروری احوال مفقود ہیں۔ انہوں

نے جن شاعروں کے بارے میں کچھ اہم معلومات دی ہے تو وہ بھی عموماً تشنہ ہیں۔ وہ احوال بیان کرتے وقت تاریخوں کا ذکر نہیں کرتے۔ اگر کچھ تاریخ بیان کرنا مقصود بھی ہوا تو ایک سال پہلے یا ایک سال بعد جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً: محمد شاکر ناجیؔ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ میاں آبروؔ کے معاصر تھے، شاہجہاں آباد وطن تھا۔ سپاہی پیشہ انسان تھے۔ چہرے پر چیچک کے نشان تھے۔ جوانی میں ہی انتقال کر گئے۔ محمد امان اللہ غریبؔ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ قریب دو سال پہلے بنگال چلے گئے۔ اسی طرح محمد علی حشمتؔ کے سال وفات کے بارے لکھا ہے کہ وہ جنگ روہیلہ میں قطب الدین خان کے ہم راہ شہید ہوئے۔ شاکر ناجیؔ کے انتقال کے بارے میں صرف یہ کہہ دینے سے کہ ان کا انتقال جوانی ہی میں ہو گیا تھا تاریخ وفات معلوم کرنا آسان نہیں ہے۔ اسی طرح محمد امان اللہ غریبؔ کے بارے میں ان کا یہ کہنا کہ دو سال پہلے بنگال چلے گئے، ان کے بنگال جانے کی تاریخ کے بارے میں علم نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہ نہ معلوم ہو جائے کہ یہ تحریر کب کی ہے۔ محمد علی حشمتؔ کی وفات کی تاریخ جاننے کے لیے جنگ روہیلہ اور قطب الدین خان کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ پروفیسر آزرمی دخت صفوی لکھتی ہیں:

> ''میر کو تفصیلات کا دماغ نہیں۔ ان کی شاعرانہ طبیعت اور نازک دماغی ترجمہ احوال کی ریزہ سنجی سے گھبراتی ہے۔....... وہ فطری طور پر شاعر تھے اور شاعر بھی کیسے حساس، زود رنج، بلند فکر، تخیل پرست۔ بھلا ان کی بے چین طبیعت اور بلند پروازی ان کو سال پیدائش وار تحال فلاں وفلاں کا خشک زادکیوں کر طے کرنے دیتی۔''

(میر کی تذکرہ نویسی کے بعض پہلو، پروفیسر آزرمی دخت صفوی، غالب نامہ: میر تقی میر نمبر، ص: ۲۰۱)

مرقع نگاری:

نکات الشعرا میں میر نے مختلف شاعروں کے جو مرقعے بیان کیے ہیں وہ اختصار کے باوجود بہت دلکش ہیں۔ حنیف نقوی انہیں مرقعوں کو نکات الشعرا کی مقبولیت کی وجہ قرار دیتے ہیں۔ سید عبداللہ کے بقول 'ہم ان نقوش میں وہ معنویت اور مصورانہ دقت نظر پاتے ہیں جو تفصیل میں نہیں مل سکتی۔' میر تقی میرؔ قزلباس خاں امیدؔ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''قزلباس خاں امیدؔ ایک مغل شخص تھا، فارسی کا عمدہ شاعر، نکتہ پرور، بذلہ سنج، جواں دل، دلوں کا پیارا، یار باس، ملنسار، ہمیشہ مسکراتا اور پھولوں کی طرح شگفتہ چہرہ، اپنے قیمتی اوقات کو خوشی اور انبساط کے ساتھ بسر کرتا تھا۔ اور یک دل صاحب طبع دوستوں کے ساتھ خوب ملنا جلنا رکھتا تھا۔ چنانچہ ایک دن حسن رسول نما صاحب قدس سرہ کے عرس کے موقع پر بندہ بھی اپنی دوستوں کے کہنے پر وہاں پہنچا ہوا تھا اور وہ بھی وہاں تشریف رکھتا تھا۔ مجھ کو دور سے ہی دیکھ کر بولا خوش ہو جایئے میں نے بھی ان دنوں ریختہ کے دو شعر موزوں کیے ہیں۔ سنیے۔''

(نکات الشعرا (مترجم)، ص: ۲۰)

مخالفین کی خوبیوں کا اعتراف:

میر کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ شاعری میں جہاں وہ سوداؔ جیسے شاعر کو جاہل کہہ دیتے ہیں وہیں نکات الشعرا میں میرؔ کا دوسرا ہی رخ دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ نکات الشعرا میں ذاتی اختلافات کو طاق میں رکھتے ہوئے اپنے مد مقابل کے کمال فن اور انسانی کمالات کی تعریف کرنے میں بخیلی سے کام نہیں لیتے۔ سوداؔ کے بارے میں ان کا یہ شعر پڑھیں:

طرف ہونا مرا مشکل ہے میرؔ! اس شعر کے فن میں
یوں ہی سودا کبھو ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

اب انہیں سودا کے بارے انھوں نے نکات الشعرا میں جو لکھا ہے اس کو پڑھیے:

''نوجوان، خوش اخلاق، خوش مزاج، گرم جوش، یار باش اور شگفتہ چہرے والے ہیں۔ ان کا مولد شاہ جہاں آباد ہے۔ نوکری پیشہ ہیں۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، قطعہ، مخمس اور رباعی تمام اصناف سخن خوب کہتے ہیں۔ وہ ہندی شاعروں کے سرتاج ہیں۔ بہت خوش فکر اور اچھا کہتے ہیں۔ ان کا ہر شعر تکرار کے عیب سے خالی، لطافت فکر دکھانے والا، چمن بندی میں ان کے الفاظ گل معنی کے گلدستے ہیں۔ ان کا ہر مصرع برجستہ اور آزاد منش سرو کے مانند ایستادہ ہوتا ہے۔ ان کی بلند پرواز فکر کے آگے بلند طبیعتیں شرمسار، ریختہ کے شاعر ہیں۔ ریختہ کا ملک الشعرا ہونا انہیں زیب دیتا ہے۔''

(نکات الشعرا (مترجم)، ص: ۳۹)

میرؔ کی تاباںؔ کے ساتھ کچھ ان بن ہوگئی تھی لیکن میرؔ نے ان کا تذکرہ لکھتے وقت ذاتی اختلاف کو جگہ نہیں دی۔ ان کے ذاتی محاسن کا اعتراف بڑی فراخ دلی سے کرتے ہیں۔ یہی نہیں میرؔ ان کے تذکرے میں اپنی غلطی کا اعتراف بھی کرنے میں جھجھک نہیں محسوس کرتے:

''بہت اچھا شاعر، خوب صورت، عمدہ اخلاق والا، ملنسار، پاکیزہ سیرت، محبوب شخصیت، محبت کرنے والا، آج تک شاعروں کے فرقے یا زمرے میں ایسے اچھے مزاج اور پسندیدہ صفات کا شاعر عدم کے بطن سے وجود میں نہیں آیا۔ اس کی زبان میں رنگینی اور پاکیزگی گلاب کی پنکھڑی سے بڑھ کر تھی۔ گلستان سخن کا نازک دماغ بلبل، اس کی فکر رنگین کا اسپ تازی موسم بہار کی پھولوں کی خوشبو سے مہکتی ہوا کے گویا قدم بقدم چلتا تھا۔....... اس کی شاعری کو مدنظر رکھیں تو اس کے استاد حشمت اس کی شاگردی کے لائق بھی نہیں دکھائی دیتے۔ فقیر کے ساتھ اس کی ایک معاملہ میں صفائی رہ گئی۔ کچھ مدت سے اس کے ساتھ اس ہیچ مداں کا ملنا جلنا کم ہوجانے کی وجہ

سے ایک طرح کی کدورت درمیان میں آگئی تھی۔ اس کی اجل نے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ اس کی تلافی ہو پاتی، تدارک ہو جاتا۔''

(نکات الشعرا (مترجم)، ص، ۹۹)

میر نے مختلف شاعروں کے احوال میں جن پسندیدہ صفات کا ذکر کیا ہے اس سے کسی انسان کو پرکھنے کے لیے میر کے معیار کا اندازہ ہوتا ہے۔ میر خوش اخلاقی، خوش مزاجی، زندہ دلی، یار باشی، شرافت اور سادگی کو کسی پسندیدہ انسان کی خصوصیت شمار کرتے ہیں۔ میر چوں کہ حسن پسند طبیعت کے مالک تھے اس وجہ سے وہ اخلاقی محاسن بیان کرنے کے ساتھ ظاہری حسن وصورت کو بھی شخصیت کے حسن کے طور پر دیکھتے تھے۔ محمد حسین آزاد نے آب حیات میں میرؔ کے خشک مزاجی، خود بینی اور بد دماغی کے بارے میں جو لکھا ہے وہ 'نکات الشعرا' کے میر تقی میرؔ کی شخصیت سے میل نہیں کھاتا۔ نکات الشعرا کا میر زندہ دل، دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرنے والا، یار باش، میلوں ٹھیلوں میں وقت گزارنے والا، عرس میں شرکت کرنے والا، بزرگوں کا احترام کرنے والا، اپنے مخالفین کے ساتھ نرمی سے پیش آنے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محمد حسین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے سامنے سے 'نکات الشعرا' گزری ہی نہیں تھی۔

معاصرانہ چشمک کی جھلکیاں:

میرؔ نے عام طور پر معاصرین کے تذکرے میں ذاتیات کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیا ہے لیکن کئی مواقع پر انہوں نے انصاف سے کام نہیں لیا ہے۔ کئی ایسے معتبر شعرا ہیں جن کی قابلیت کا اعتراف اکثر تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ میرؔ نے ان کے بارے میں اچھی رائے نہیں پیش کی ہے۔ ایسے شعرا میں شاہ حاتم، محمد یار خاکسار، انعام اللہ خاں یقین، میر محمد باقر حزیں اور محمد فقیہ دردمند وغیرہ شامل ہیں۔ میر نے جن شعرا کی تنقیص کی ہے ان میں سے اکثر مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد تھے۔ اس کی وجہ محمود الٰہی معاشرانہ چشمک قرار دیتے ہیں۔ دراصل جب میر دہلی میں وارد ہوئے تو یہاں شاعروں کے دو حلقے تھے۔ ایک خان آرزو کے شاگردوں کا حلقہ تھا دوسرا مرزا مظہر جان جاناں کے شاگروں اور معتقدوں کا تھا۔ میر کی قربت خان آرزو کے ساتھ تھی۔ استادی وشاگردی کے اس دور میں دوسرے گروہ کے شعرا کو کمتر اور اپنے گروہ کے شاعروں کو برتر دکھانا عام سی بات تھی۔ میر نے مرزا مظہر جان جاناں کی شخصیت کی خوبیوں کا اعتراف کیا ہے۔ ان کی استادی پر بھی کوئی سوال نہیں قائم کیا ہے لیکن ان کے شاگردوں میں سے اکثر کو انہوں نے نہیں بخشا۔ کئی اہم شعرا جن کی استادی اس زمانے میں مسلم مانی جاتی تھی ان کو تذکرہ میں شامل ہی نہیں کیا۔ مثلاً احسن اللہ بیاںؔ، خواجہ محمد ظاہر خاں ظاہرؔ، شیو سنگھ ظہورؔ اور سیتا رام عمدہؔ کو انہوں نے نکات الشعرا میں جگہ نہیں دی۔ جن شعرا کو انہوں نے جگہ دی وہ بھی ان کے طعن وتشنیع سے نہ بچ سکے۔ انعام اللہ خاں یقیںؔ کے بارے میں لکھا ہے کہ 'مرزا مظہر جان جاناں ان کو اشعار لکھ کر دیتے تھے'۔ 'شعر فہمی کی تمیز ان کو چھو کر ....'فرعون کی رعونت بھی ان کے سامنے بے چارگی کا اظہار کرے'.......

نہیں گزری'......... 'لوگوں کا گمان ہے کہ یہ شخص موزوں طبع ہی نہیں ہے۔'' محمود الٰہی کے مطابق چوں کہ اس زمانے میں مرزا مظہر جان جاناں نے شاعری ترک کر دی تھی اور ان کے حلقۂ تلامذہ کی قیادت یقیںؔ کر رہے تھے۔ اس وجہ سے میرؔ نے سب سے بڑا حملہ انہیں پر کیا۔ ان کی شاعری کو سرقہ اور انہیں غیر موزوں طبیعت کا قرار دیا۔ قدرت اللہ قدرتؔ کے بارے میں لکھا 'عاجز از سخن است'۔ اس جیسی اور بھی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ میر کی ان آرا کا ردِ عمل اسی زمانے میں سامنے آ گیا تھا۔ اس سلسلے میں تین نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ گردیزیؔ کا 'تذکرۂ ریختہ گویاں'، شفیق اورنگ آبادی کا 'چمنستان شعرا' اور قدرت اللہ قدرت کا 'مجموعہ نغز'۔ یہ سبھی تذکرے اسی مخالفانہ روش کو ظاہر کرتے ہیں۔

میرؔ کی تنقیدی آرا:

'نکات الشعرا' کی اہمیت ان حصوں کی وجہ سے بھی ہے جس میں انہوں نے مختلف شعرا کے کلام کے محاسن و معائب پر اپنی رائے دی ہے۔ حالاں کہ یہ حصہ قدرے کم ہے۔ حنیف نقوی کے مطابق میر نے تقریباً چونسٹھ شاعروں کے کلام پر کوئی رائے نہیں دی ہے۔ انہوں نے جن شعرا پر اپنی رائے دی ہے اس کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر کی نظر میں اچھی شاعری کی کیا خصوصیات تھیں۔ میرؔ مختصر جملوں میں بڑی پتے کی بات کہہ جاتے ہیں۔ ان کی رائے عموماً 'جامع اور متوازن' ہوا کرتی ہے۔ حنیف نقوی کا ماننا ہے کہ ''ان (رایوں) کے اظہار میں آزادی مطلق سے کام نہ لیتے ہوئے بعض لسانی وفنی تصورات اور ادبی نظریوں کی پابندی کی گئی ہے۔''

میر نے نکات الشعرا کے آخر میں ریختہ کے اقسام بیان کرتے وقت ان سے متعلق چند اہم باتیں بیان کی ہیں۔ ان کی روشنی میں میرؔ کا نظریۂ شعر مرتب کیا جا سکتا ہے۔ میر کے نزدیک شاعری ایک وہبی چیز ہے۔ وہ صنعتوں کے بے تکلف استعمال، فارسی کی مانوس تراکیب، بیان کی صفائی، بندش الفاظ اور فصاحت و بلاغت کے التزام کو شاعری کا لازمی جز قرار دیتے ہیں۔ ایہام کو پسند کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ وہ شاعری کو محض لفاظی نہیں سمجھتے۔ میر کے یہ خیالات نکات الشعرا کے صفحات میں بکھرے ہوئے ہیں۔ میرؔ نے شاعروں پر اظہار خیال کرتے وقت اور خود اپنی شاعری میں بھی اس کو برتا ہے۔ مختلف شاعروں پر انہوں نے جو تنقیدی رائے دی ہے اس کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔ محمد حسین کلیم کے کلام پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''ان کی طرز کسی اور کی طرز کی مماثل نہیں ہے۔ بیشتر وہ مرزا بیدل کی زبان میں بات کرتے ہیں۔ ان کے تہ دار شعر کو سمجھنے میں عاجز الکلاموں کی قوت فکر اپنی عاجزی کا اظہار کرتی ہے اس کی طبع رواں تیز دھارے کی مانند بہتی ہے اور اس کی فکر رسا آسمان کے اس پار جاتی ہے۔ ان کی فکر کا باز و معنی کی کمان کو زور سے کھینچتا ہے اس کے پیچ دار

اور پر تاثیر اشعار تیر کا کل رہا ہیں۔ حالانکہ کلیم (نامور شاعر) فارسی میں گزر چکا ہے لیکن ریختہ کا کلیم فقیر کے نزدیک یہ ہے۔''

(نکات الشعرا (مترجم)، ص: ۴۷)

محمد عارف عارفؔ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''نئے لفظ خوب تلاش کر کے لاتا ہے۔ مہینے سال میں ایک آدھ شعر موزوں کرتا ہے۔ اس کی شاعری البتہ لطف سے خالی نہیں ہے۔''

(نکات الشعرا (مترجم)، ص: ۱۱۶)

ہدایت اللہ ہدایت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ملنے جلنے میں عجز و انکساری کے ساتھ پیش آتا ہے لیکن شاعری کے میدان میں اس کا بھاری بھرکم قلم تنے ہوئے بال پر راستہ چلتا ہے۔ بندہ اس کے انداز و اسلوب سے بہت لطف اندوز ہوتا ہے۔''

(نکات الشعرا (مترجم)، ص: ۱۱۵)

جعفر زٹلی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''وہ اپنے وقت کا انوکھا اور اپنے دور کا عجوبہ کردار تھا۔ اس کی زبان کاٹ کھانے والی تھی۔''

(نکات الشعرا (مترجم)، ص: ۳۷)

احسن اللہ احسن کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ان کی طبیعت ایہام کی طرف بہت مائل تھی۔ اس رجحان کے غلبہ کی وجہ سے ان کی شاعری بے رتبہ رہ گئی۔''

(نکات الشعرا (مترجم)، ص: ۳۴)

عبدالولی عزلتؔ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ان کے کلام کے طرزوں سے یہ شان ظاہر ہوتی ہے کہ دردمندی ان کی یہاں بہت ہے۔''

(نکات الشعرا (مترجم)، ص: ۸۴)

مذکورہ بالا آرا کی روشنی میں میر کے نظریۂ شعر اور ان کی تنقیدی بصیرت کو سمجھا جا سکتا ہے۔

شاعروں کے کلام پر اصلاح:

میر کے بعض اہم تنقیدی خیالات شاعروں کے کلام پر ان کے اصلاحات سے معلوم ہوتے ہیں۔ میر نے کم ہی شعرا کے کلام پر اصلاح کا کام کیا ہے۔لیکن جہاں انہوں نے ضروری سمجھا ہے بے لاگ اپنی رائے رکھی ہے۔ مثال کے طور پر میر سجاد اکبرآبادی کے ایک شعر میں محاوروں کے غلط استعمال پر ان کی اصلاح کرتے ہیں۔ سجاد اکبرآبادی کا شعر یوں ہے:

میرا جلا ہوا دل مژگاں کے کب ہے لائق
اس آبلہ پا کو کیوں تم کانٹوں میں اینچتے ہو

میر لکھتے ہیں:

''محاورہ میں تصرف جائز نہیں ہے۔محاورہ اس طرح سے ہے:'کیوں کانٹوں میں گھسیٹے ہو' لیکن جب شاعر کو سخن میں قدرت حاصل ہو تو معانی پا جاتا ہے۔''

(نکات الشعرا (مترجم)،ص:٦٤)

میر کی نظر میں شاعروں کے مخاطب عوام نہیں خواص ہیں اس لیے شاعروں کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ غلط العوام کو شاعری میں استعمال کریں۔محمد حسین کلیم نے ایک شعر میں مرزا مظہر'جان جاں' کے بجائے 'جان جاناں' استعمال کیا۔اس پر میر نے لکھا ہے کہ ''نام مرزا جان جاں است وشاعر جان جاناں بستہ۔ چوں اکثر عوام نام مرزا از غلطی جان جانان گویند۔ شاعر مذکور بر شہرت ہم چنیں موزوں کردہ اگر چہ نمی بایست کہ گفتگوئے با خواص است۔''

اس کے علاوہ انہوں نے مختلف شعرا کے کلام پر مناسب اصلاح کرتے ہوئے ان کے اشعار کی نوک پلک کو درست کیا ہے۔اردو کی شعری روایت میں استادی وشاگردی کی قدیم روایت رہی ہے۔استادفن کے سامنے ان کے شاگرد اپنا کلام پیش کیا کرتے تھے جس پر وہ اصلاح کر دیا کرتے تھے۔نکات الشعرا میں میرؔ نے اگر کوئی قابل اصلاح شعر دیکھا تو اس کی اصلاح کر دی ہے۔مثال کے طور پر چند اشعار اور ان پر میر کی اصلاح دیکھیے :

شاہ مبارک آبرو کا شعر ہے:

نہیں تارے بھرے ہیں شک کے نقط
اس قدر نسخۂ فلک ہے غلط

میر کہتے ہیں ''اگر'اس قدر' کے بجائے 'کس قدر' ہوتا تو شعر آسمان کو پہنچ جاتا۔''

شرف الدین مضمونؔ کا شعر ہے:

میرے پیغام کو تو اے قاصد
کہیو سب سے اسے جدا کر کر

میر کہتے ہیں: ''اگر 'پیغام کو' کے بجائے 'پیغام وصل' کہتے تو یہ نچلے درجہ سے اعلیٰ درجہ کا ہو جاتا۔''

یک رنگ کا ایک شعر ہے:

اس کو مت بوجھو سجن اوروں کی طرح
مصطفیٰ خاں آشنا یکرنگؔ ہے

میر کہتے ہیں: ''اگر یہ میرا شعر ہوتا تو پہلا مصرع میں نے اس طرح موزوں کیا ہوتا:

'مت تلوّن اس میں سمجھے آپ سا'

مذکورہ بالا مثالوں سے جہاں ایک طرف میر کی سخن فہمی کا اندازہ ہوتا ہے وہیں ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاعری میں کن چیزوں کو اہمیت اور ترجیح دیتے ہیں۔

عہد میرؔ کی معاشرت:

نکات الشعرا کی ایک اہمیت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ ہمیں میر کے عہد کی معاشرت کی جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اردو میں شعر کہنے والے فارسی شعرا سے الگ شناخت پر اصرار کرتے تھے۔ وہ مشاعرہ کے بجائے اپنی محفلوں کو مراختہ کا نام دیتے تھے۔ اہل علم کے درمیان باہمی روابط اور ان کی ادبی سرگرمیوں کا بھی علم ہوتا ہے۔ میر جب کسی ایسے شاعر کا ذکر کرتے جن سے ان کے مراسم تھے تو اس کا بیان کرتے ہیں۔ بزرگوں کی صحبت میں حاضری، اولیا اللہ سے عقیدت وغیرہ کا علم ہمیں نکات الشعرا سے ہوتا ہے۔

10.3.3 ماحصل

''نکات الشعرا'' اردو شاعروں کے اولین تذکروں میں سے ایک ہے۔ اکثر محققین نے اس کو اردو کا پہلا تذکرہ شمار کیا ہے۔ اس کی زبان فارسی ہے۔ اس کتاب سے میرؔ کی تنقیدی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ میرؔ نے اس میں کل ایک سوتین شاعروں کا ذکر کیا جس میں ایک وہ خود ہیں۔ انہوں نے شاعروں کا تذکرہ لکھتے وقت نہ زمانی ترتیب کا لحاظ رکھا ہے اور نہ حروف تہجی کا۔ شمالی ہند کے شعرا کے درمیان ہی دکن کے شعرا کا احوال بیان کرتے ہیں اور پھر شمال کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ دکن کے شعرا سے ان کی واقفیت عزلتؔ کے بیاض کے توسط سے ہوئی۔

میؔر شاعروں کا تذکرہ کرتے وقت اختصار سے کام لیتے ہیں انہوں نے شاعروں کے بہترین مرقعے اس کتاب میں شامل کیے ہیں۔ میؔر نے عام طور سے غیر جانب داری کا ثبوت دیا ہے لیکن بعض محققین کا کہنا کہ انہوں نے مظہر جان جاناں کے شاگردوں کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا ہے۔ میؔر نے جہاں ضروری سمجھا ہے شاعروں کے کلام پر اصلاح بھی کی ہے۔ نکات الشعرا کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کی روشنی میں ہم میؔر کی پسند و ناپسند کو جان سکتے ہیں۔ پروفیسر آزرمی دخت کی اس بات میں صداقت ہے کہ نکات الشعرا تذکرۂ شعرا سے زیادہ میؔر کے جہانِ قلبی کی طرف ایک دریچہ ہے۔ نکات الشعرا پڑھنے والے کو دیگر شاعروں کے احوال ملیں یا نہ ملیں لیکن بین السطور میں میر کے احوال ضرور مل جائیں گے۔ عبادت بریلوی میر کی آرا کو 'جچی تلی اور حقیقت پر مبنی' قرار دیتے ہیں۔ نکات الشعرا کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ میر کے پاس شاعروں کے کلام کو جانچنے کے کچھ پیمانے تھے جن کی پیروی وہ خود بھی کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ دوسرے شعرا بھی اس کو تسلیم کریں۔

10.4 آپ نے کیا سیکھا؟

عزیز طلبا! اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے:

- تذکرہ نگاری کے فن اور اس کے بنیادی محرکات کو جانا۔
- ''نکات الشعرا'' کے موضوعات و مضامین کو جانا۔
- میؔر کے شعری رجحانات اور ترجیحات کو جانا۔
- میؔر کے نظریۂ شعر اور ان کے تنقیدی شعور کو سمجھا۔
- ''نکات الشعرا'' کی ادبی اہمیت وافادیت اور معنویت کو جانا۔

10.5 اپنا امتحان خود لیجیے

۱۔ ''نکات الشعرا'' کی پہلی اشاعت کب ہوئی؟ اور اس کے بعد کے ایڈیشن کی تفصیل تحریر کیجیے۔

۲۔ تذکرہ میں بنیادی طور پر کن چیزوں کو شامل کیا جاتا ہے؟ وضاحت کیجیے۔

۳۔ حنیف نقوی کے بیان کردہ تذکرہ کے بنیادی محرکات کو قلم بند کیجیے۔

۴۔ محمد حسین کلیم کے کلام کے متعلق میر کی کیا رائے ہے؟ بیان کیجیے

۵۔ عہد میؔر کی معاشرت کے حوالے سے ''نکات الشعرا'' کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

10.6 سوالوں کے جواب

۱۔ ''نکات الشعرا'' کی پہلی اشاعت انجمن ترقی اردو کی طرف سے ۱۹۲۲ء میں مولوی حبیب الرحمٰن شیروانی کے مقدمہ کے ساتھ ہوئی۔ بعد میں ۱۹۳۵ء میں انجمن ترقی اردو نے مولوی عبدالحق کے مقدمہ کے ساتھ

اس کو دوبارہ شائع کیا۔ اس کی تیسری اشاعت ۱۹۷۲ء میں پروفیسر محمود الٰہی کے مقدمہ کے ساتھ ہوئی۔ ان کے پاس پیرس کا ایک قلمی نسخہ تھا، جس کی کتابت ۱۱۷۸ ہجری میں سورت میں ہوئی تھی۔ محمود الٰہی نے دوران متن اس نسخے سے بھی استفادہ کیا ہے۔

۲۔ تذکروں میں بنیادی طور پر تین چیزیں شامل ہوتی ہیں شاعر کے مختصر حالات، اس کے کلام پر مختصر رائے یا تبصرہ اور آخر میں اس کے کلام کا انتخاب شامل کیا جاتا ہے جس میں عموماً غزلوں کو جگہ دی جاتی ہے۔

3 ڈاکٹر حنیف نقوی تذکرہ نگاری کے پیچھے کارفرما جن محرکات کو زیر بحث لائے ہیں ان میں بقائے نام کی آرزو، ارباب کمال کی قدر شناسی، ادبی و تحقیقی ذوق کی تسکین، تاریخی شعور، رقابت اور معاصرانہ چشمکیں، ادبی گروہ بندی، احباب و اعزہ کی فرمائشیں، سرپرستوں کی خوشنودی، مشاعروں کی گرم بازاری، اور پسندیدہ کلام کو باقاعدہ نظم و ترتیب کے ساتھ جمع کرنے کا شوق شامل ہیں۔

۴۔ کلیم کے متعلق میر کی رائے یہ ہے کہ ''ان کی طرز کسی اور کی طرز کی مماثل نہیں ہے۔ بیشتر وہ مرزا بیدل کی زبان میں بات کرتے ہیں۔ ان کے تہ دار شعر کو سمجھنے میں عاجز الکلاموں کی قوت فکر اپنی عاجزی کا اظہار کرتی ہے اس کی طبع رواں تیز دھارے کی مانند بہتی ہے اور اس کی فکر رسا آسمان کے اس پار جاتی ہے۔ ان کی فکر کا بازو معنی کی کمان کو زور سے کھینچتا ہے اس کے پیچ دار اور پرتاثیر اشعار تیر کا کل رہا ہیں۔ حالانکہ کلیم (نامور شاعر) فارسی میں گزر چکا ہے لیکن ریختہ کا کلیم فقیر کے نزدیک یہ ہے۔''

۵۔ ''نکات الشعرا'' کی ایک اہمیت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ ہمیں میر کے عہد کی معاشرت کی جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اردو میں شعر کہنے والے فارسی شعرا سے الگ شناخت پر اصرار کرتے تھے۔ وہ مشاعرہ کے بجائے اپنی محفلوں کو مراختہ کا نام دیتے تھے۔ اہل علم کے درمیان باہمی روابط اور ان کی ادبی سرگرمیوں کا بھی علم ہوتا ہے۔ میر جب کسی ایسے شاعر کا ذکر کرتے جن سے ان کے مراسم تھے تو اس کا بیان کرتے ہیں۔ بزرگوں کی صحبت میں حاضری، اولیا اللہ سے عقیدت وغیرہ کا علم ہمیں نکات الشعرا سے ہوتا ہے۔

10.7 فرہنگ

(الفاظ)		(معنی)
اسپ	:	گھوڑا
تدارک	:	مکافات، بدلہ
تشنہ	:	ناقص، نامکمل

تیمُناً	:	تبرکاً
تلوّن	:	رنگینی، ایک حالت پر قائم نہ رہنا
چشمک	:	ہلکی رنجش ہونا
خوانندہ	:	پڑھنے والا
فکررسا	:	اصل مقصد تک پہنچنے والی سوچ
متقدمین	:	متقدم کی جمع، جو لوگ پہلے وفات پا چکے
مژگاں	:	پلکیں
معاصر	:	ایک ہی زمانہ کا
مفقود	:	جو نہ پایا جائے
ہیچ	:	کمتر

10.8 کتب برائے مطالعہ

ا۔	نکات الشعرا	:	مرتبہ محمود الٰہی
۲۔	نکات الشعرا (مترجم)	:	حمیدہ خاتون
۳۔	اردو شعرا کے تذکرے	:	عبادت بریلوی
۴۔	غالب نامہ: میر تقی (میر نمبر)	:	غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی
۵۔	شعرائے اردو کے تذکرے	:	حنیف نقوی

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY